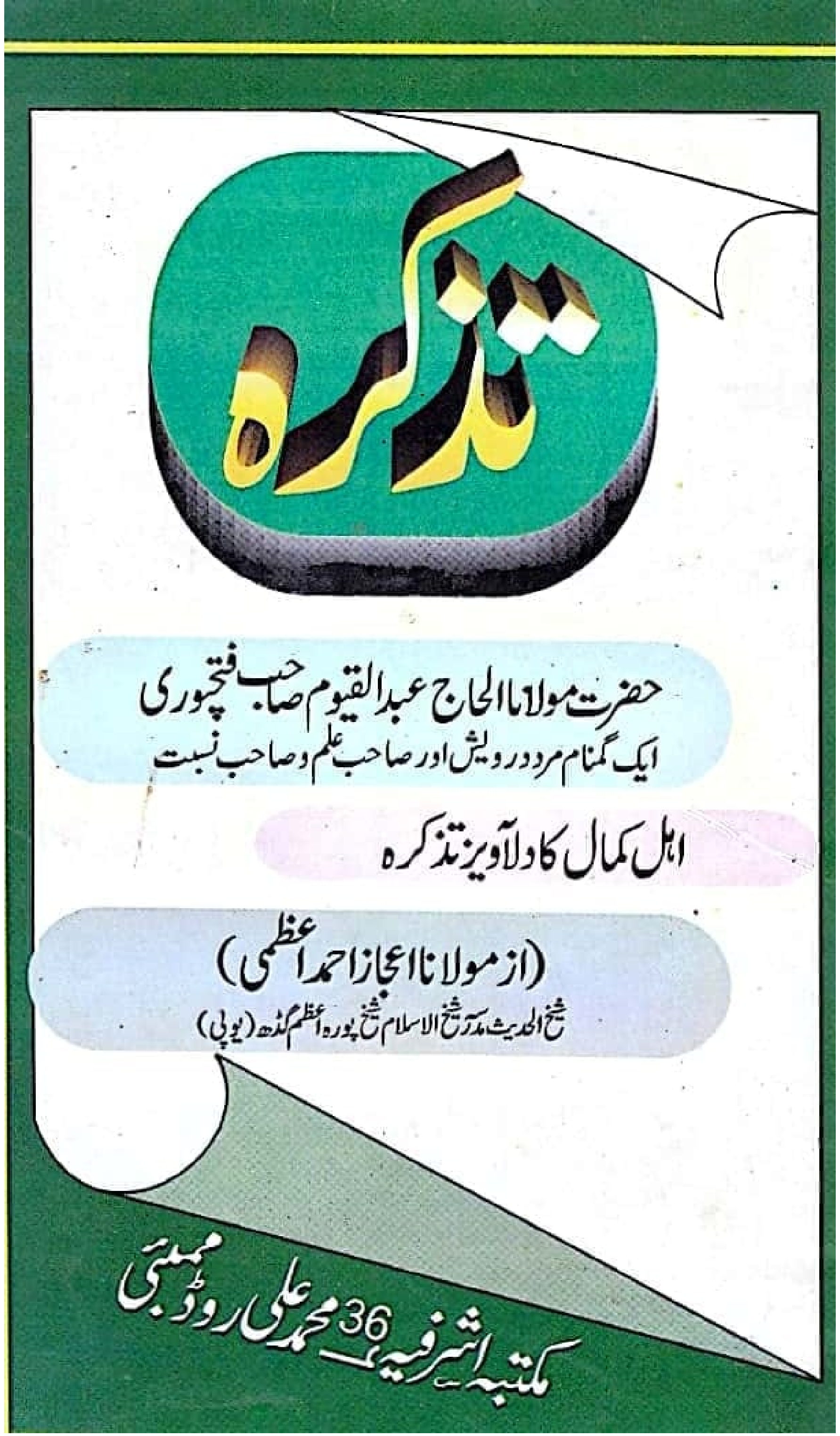

تذکرہ

حضرت مولانا الحاج عبد القیوم صاحب فتحپوری

ایک گمنام مرد درویش اور صاحب علم و صاحب نسبت

اہل کمال کا دلآویز تذکرہ

(از مولانا اعجاز احمد اعظمی)

شیخ الحدیث مدرسہ شیخ الاسلام شیخ پورہ اعظم گڈھ (یوپی)

مکتبہ اشرفیہ 36 محمد علی روڈ ممبئی

تذکرہ

حضرت مولانا الحاج

عبد القیوم صاحب فتحپوری

ایک گمنام مرد درویش اور صاحب علم و صاحب نسبت
اہل کمال کا دلآویز
تذکرہ

از قلم: مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی
شیخ الحدیث
مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور، اعظم گڑھ

ناشر
مکتبہ اشرفیہ ۳۶ محمد علی روڈ، بمبئی ۳

کاتب اتقی، احمد مئو فون ۲۲۵۴۳۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

از حضرت مولانا قاری ولی اللہ صاحب زید مجدہم امام و خطیب مسجد نور، بمبئی

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفٰی، اما بعد!

یہ تذکرہ والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ہے۔ یہ ان کے مختصر سوانح و واقعات ہیں، جنکو ہمارے دوست شیخ الحدیث جناب مولانا اعجاز احمد صاحب صدر مدرس مدرسہ شیخ الاسلام، مقام شیخوپور، ضلع اعظم گڑھ نے، میرے عرض کرنے پر ترتیب دیا ہے۔ انھوں نے والد صاحبؒ کو دیکھا نہیں ہے، اسی طرح انھوں نے مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو بھی نہیں دیکھا ہے، لیکن حضرت کا تذکرہ "حیات مصلح الامت" کے نام سے لکھا ہے، اور ماشاء اللہ خوب لکھا ہے، جیسے وہ حضرتؒ کی صحبت میں رہے ہوں۔ مولانا موصوف ماشاء اللہ اس میدان کے شہسوار ہیں۔ انھوں نے میرے کہنے پر بے تامل منظور فرماتے ہوئے اس سوانح کو مرتب فرما دیا ہے۔ جس کیلئے میں ان کا بے حد ممنون ہوں، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی شان کے مطابق بدلہ عطا فرمائیں۔

بڑی ناشکری ہوگی اگر میں اپنے دو بزرگوں یعنی مولانا قمر الزماں صاحب زید مجدہم اور حافظ محمد زکریا صاحب زید مجدہم کا شکریہ نہ ادا کروں، کہ در اصل اکثر معلومات انھیں دونوں بزرگوں نے جمع فرمائی ہیں۔ انھیں کی مدد سے مولانا اعجاز احمد صاحب نے اس کو ترتیب دیا ہے، اللہ تعالیٰ ان حضرات کو بھی جزائے خیر عطا فرمائے۔

اخیر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سوانح کو مقبول عام بنائے، اور صاحب سوانح کے نقش قدم پہ چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ولی اللہ غفرلہٗ۔

تقریب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین اما بعد

یہ چند سطریں ایک گمنام لیکن باکمال مرد درویش ایک مستور لیکن صاحب نسبت مرد حق کی یاد میں لکھی جارہی ہیں۔ کمال کے لئے شہرت لازم نہیں ہے جیسے شہرت کے لئے باکمال ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس دنیا میں کتنی باکمال ہستیاں گزری ہیں۔ جنھیں نہ ان کے زمانے میں پہچانا گیا، نہ بعد میں انکی شہرت ہوئی، اور کتنے ہی بے کمال اور بے ہنر افراد آسمان شہرت و ناموری پر جگمگا رہے ہیں شہرت نہ دلیل اخلاص ہے اور نہ ثمرۂ قبول حق ! بلکہ بسا اوقات ناموری سامان فتنہ بن جاتی ہے۔ دنیا میں لوگوں کی انگلیاں اٹھتی ہیں اور آخرت میں آدمی مواخذہ میں گرفتار ہوتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

بحسب امرئ من الشر ان یشار الیه بالاصابع فی دین او دنیا الا من عصمه الله۔
(رواه البیهقی فی شعب الایمان)[1]

آدمی کے مبتلائے شر ہونے کیلئے یہ کافی ہے کہ اس کی طرف دین یا دنیا کے سلسلے میں انگلیوں سے اشارہ کیا جائے۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کی حفاظت فرمائیں (تو اور بات ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی خاص حفاظت نہ ہو تو مشہور آدمی مبتلائے فتنہ ہو کر رہتا ہے، اسی لئے گمنامی اور خمول و خفا ایک امر محمود ہے، جو آدمی گمنام رہا۔ اس نے بہت سی آفات سے نجات پالی۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی باکمال نے شہرت نہیں پائی، بعد والوں میں اس کا چرچا نہیں ہوا، تاریخ کے اوراق میں اس کا ذکر نہیں آیا۔ اس کے آگے پیچھے آدمیوں کا ہجوم نہیں ہوا۔ تو زمانے نے اس کی ناقدری کی، یا اس کے کمال میں کوئی خاص نقص تھا۔ یا اس کے اخلاص میں کمی تھی۔ لیکن یہ خیال عموماً صحیح نہیں ہے۔ اگر کوئی اللہ کا نیک اور مخلص بندہ ہے، صاحب علم و صاحب کمال ہے، اللہ کی نسبت کا حامل ہے۔ اس کی زندگی سنت و شریعت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے، اس کے فیض سے متعدد لوگ فیض یاب بھی ہوئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کا تعارف نہیں ہوا ایک مخصوص اور مختصر حلقے کے باہر اس کا نام نہیں لیا گیا، پھر جوں جوں ماضی کے پردے دبیز ہوتے گئے، اس کا مختصر سا تعارف بھی مٹتا گیا، تو کیا ہم اسے ناکام کہیں گے؟ اس کے بارے میں بے کمال ہونے کا وسوسہ دل میں لائیں گے۔ اگر کوئی شخص ایسا سمجھتا ہے تو اس نے قرآن نہیں پڑھا، حدیث نہیں سمجھی، شریعت کی روح کو نہیں پہچانا، اللہ تعالیٰ کے معاملات سے باخبر نہیں ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

---

[1] مشکوٰۃ شریف باب الریاء والسمعۃ۔

انّ اللہ یحب الابرار الاتقیاء
الاخفیاء الّذین اذا غابوا لم
یتفقدوا وان حضروا لم یُدعوا
ولم یقربوا، قلوبہم مصابیح الہدیٰ
یخرجون من کل غبراء مظلمۃ.
(رواہ ابن ماجہ والبیہقی فی شعب الایمان[1])

اللہ تعالیٰ متقی، نیک مستور الحال لوگوں سے محبت رکھتے ہیں۔ جن کا حال یہ ہے کہ اگر وہ غائب ہوں، تو انھیں کوئی نہ ڈھونڈھے، اور اگر موجود ہوں، تو نہ انھیں بلایا جائے، نہ قریب کیا جائے، ان کے قلوب ہدایت کے چراغ ہیں۔ غبار آلود اور تاریک جگہوں سے وہ نکلتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ان کی رہائش گاہیں، عالیشان، نمایاں، اور ممتاز نہیں ہوتیں، کچے اور اندھیرے گھر ان کے مسکن ہوتے ہیں۔ لیکن صرف ان کے گھر ہی اندھیرے ہوتے ہیں، ان کے دل ہدایت کے روشن چراغ ہوتے ہیں۔ جن سے لوگ راہ حق کا پتہ پاتے ہیں۔ ایسے گمنام لوگ اللہ کے خصوصی محبوب ہوتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شہرت یافتہ حضرات، خدا کے محبوب نہیں ہو سکتے، اللہ تعالیٰ جب کسی شخص سے دین کا اہم اور عام کام لینا چاہتے ہیں، تو اسے مشہور کر دیتے ہیں، ایسے لوگوں کی حفاظت کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے، شہرت ان کے لئے باعث فتنہ نہیں بنتی، مخلوق خدا ان سے فائدہ اٹھاتی ہے، یہ لوگ وہ ہوتے ہیں، جو خود گمنامی کو پسند کرتے اور شہرت سے نفور رہتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ اپنی حکمت بالغہ سے انھیں ان کے ارادہ کے بغیر ناموری عطا فرماتے ہیں۔ مشاہیر کی بزرگی اور ان کا تقویٰ وتدین لوگوں کے درمیان معروف ہوتا ہے، اس سے لوگوں کو دھوکہ ہوتا ہے کہ بزرگ، صاحب نسبت اور باکمال وہی ہے۔ جسے

---

[1] مشکوٰۃ شریف باب الریاء والسمعہ۔

شہرت کی سند مل گئی۔ اور جو ایسا نہیں ہوا، لوگ اس کو نگاہ سے گرا دیتے ہیں، مذکورہ بالا احادیث اس طرزِ عمل کی کھلی تغلیط ہے، بلکہ ان گمنام اور مستور حضرات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کا چراغ قرار دیا ہے۔ تو انھیں تلاش کرنا چاہیئے، اور ان کی روشنی میں راہ ہدایت طے کرنے کو سعادت سمجھنا چاہیئے۔ مگر لوگ عموماً ایسے بزرگوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں، مورخ کی آنکھ بھی ان سے نگاہ پھیر لیتی ہے تاریخ کی زبان ان کے حق میں گنگ ہو جاتی ہے، اور یہ تاریخ تو عجیب شے ہے بقول ایک دیندار، صاحب دل، اور صاحب درد اردو کے شاعر و ادیب ڈاکٹر کلیم عاجز کے کہ:

> "تاریخ تو امیر زادی ہے، بادشاہ زادی ہے، یہ تو شاہراہوں پر اٹھلاتی پھرتی ہے، برق رفتار گھوڑے پر اڑی پھرتی ہے، اڑن کھٹولوں پر، پرواز کرتی ہے یہ میناروں کو دیکھتی پھرتی ہے، قبوں اور کلسوں کی زیارت کرتی پھرتی ہے، لال قلعہ، تاج محل، قطب مینار، اشوک کی لاٹ، اجمیری گیٹ، کشمیری گیٹ کی بات کرتی ہے یہ کونوں میں نہیں جھانکتی، گوشوں پر نگاہ نہیں ڈالتی، یہ تنگ گلیوں اور تاریک کوچوں میں جانے سے ڈرتی ہے، یہ محلوں کے پھاٹکوں پر کارڈ بھیج کر استقبال کراتی ہے۔ یہ ٹوٹے پھوٹے دروازوں پر اور بے کواڑ کی ڈیوڑھیوں پر دستک نہیں دیتی"[1]

لیکن واقعہ یہ ہے کہ انھیں تنگ گلیوں، تاریک کوچوں اور بے کواڑ کی

---

[1] جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی ص۶۳

ڈیوڑھیوں سے لعل شب تاب نکلتے ہیں، اکثر غریب اور بے نام لوگ اس طرح ملتے ہیں، جیسے نالی کی کیچڑ میں چمکتا ہوا ہیرا، گرد و غبار ہی میں حسن کا چمکتا دمکتا مکھڑا بارہا نظر آیا ہے، جنھیں حقیر سمجھا گیا، ان میں بہت توقیر والے ملے، پستیوں میں بہت بلندیاں دکھائی دیں، یہ پیمانہ ہی غلط ہے، کہ مورخ اور سیرت نگار کے قلم سے جو رہ گیا، وہ ہنر اور کمال سے بھی خالی تھا جس کی نگاہ اسلام کی تعلیمات پر ہو گی۔ وہ تو کبھی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ صاحب کمال وہی ہے، جسے نام آوری ملی، اور جو بے نام رہا اور گمنام گیا، وہ بے کمال بھی تھا۔

انھیں گمنام بزرگوں میں ہمارے محسن بزرگ مولانا قاری ولی اللہ صاحب فتحپوری مدظلہ کے والد گرامی حضرت مولانا عبد القیوم صاحب علیہ الرحمہ بھی تھے، جن کو اللہ تعالیٰ نے شہرت کی حشر سامانیوں سے محفوظ رکھا۔ کمالات ظاہری و محاسن باطنی سے لبریز ہوتے ہوئے گمنام و مستور رہے، ان کی زندگی میں لوگوں نے انھیں دیکھا ان کی باتیں سنیں، ان کی مہمان نوازیوں سے مستفید ہوئے، انھیں تلاوت کرتے دیکھا، ان کی نمازوں کو دیکھا، ان کی استقامت کو دیکھا، لیکن سادگی و بے رنگی کی گدڑی میں جو لعل چھپا ہوا تھا، اس پر کس کی نگاہ گئی؟

حق تو یہ ہے کہ جس نے زندگی بھر اپنے کو مخفی رکھا، جس کو شہرت و ناموری کی کوئی لپک نہ تھی، جو اپنے کمال علمی و عملی کے باوجود گمنامی کی دبیز چادر میں لپٹا رہا۔ اسے، اور اس کے حالات کو اللہ تعالیٰ کے علم و ہنر کے حوالے ہی رکھا جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ حروف و نقوش کی آڑھی ترچھی لکیریں، اس کے واقعی اوصاف و محامد کے حق میں راہ انصاف سے دور جا پڑیں۔

تاہم بعد والوں کا یہ بھی فریضہ ہے کہ اگلوں کے محاسن اعمال،

مکارم اخلاق اور معالی احوال کو یاد رکھیں، ان کا مذاکرہ کریں، انھیں بعد والی نسل تک منتقل کریں۔ تاکہ بعد والوں کو یاد رہے کہ ان کے اسلاف کیسے تھے؟ ان میں اتباعِ سنت کی کیا شان تھی؟ ان کے احوال باطنی کیا کیا تھے؟ پھر ان کے دل میں حوصلہ اور ولولہ جاگے، کہ ہمارے بزرگ بھی خاک کے پتلے ہی تھے، گوشت و پوست کے ڈھانچے ہی تھے، انھیں امراض و عوارض میں وہ بھی گھرے رہتے تھے جن میں آج کا انسان مبتلا ہے مگر اس کے باوجود وہ بندگی کا حق کس طرح ادا کرتے رہے۔ انھوں نے اللہ کو راضی کرنے کے کیا کیا جتن کئے، انھوں نے دنیوی مال و دولت کو کس طرح اپنی ٹھوکر میں رکھا۔ کیا یہ سب کچھ انھیں کے ساتھ مخصوص تھا، ان کے بعد جو خاک کے پتلے تیار ہوئے، اور ہڈیوں کے جو ڈھانچے گوشت پوست کا لباس پہن کر وجود میں آئے، کیا وہ اس صلاحیت سے محروم ہیں؟ جب انھیں یہ خیال آئے گا تو ان کے اندر کی سوئی ہوئی عبدیت جاگے گی۔ چھپا ہوا جذبہ کمال ابھرے گا، خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑ سکتا ہے، ایک چراغ سے دوسرا چراغ جل سکتا، ایک طوطی کی آواز سن کر دوسرا طوطی ترنم ریز ہو سکتا ہے۔ تو کیا معنی کہ ایک انسان، دوسرے انسان کو دیکھ کر اسی کی راہ پر نہ چل پڑے۔

سیرت نویسی اور سوانح نگاری کی اصل منشا یہی ہونی چاہئیے، اور پڑھنے والوں کو بھی اسی نظر سے پڑھنا چاہئیے، واقعات و حکایات کا بیان، شہور و سنین کا اہتمام، تاریخ و یوم کی تقدیم و تاخیر پر گہری نظر، مورخ کا فریضہ ہو تو ہو سوانح نگار کو اس کا مکلف نہیں بنایا جا سکتا، اس سلسلے میں اس کے تسامحات قابل عفو ہیں۔ یہاں جو کچھ لکھا جائے گا اسے مورخ کی نگاہ سے نہ پڑھئے، بلکہ تذکیر و اعتبار کی نگاہ سے پڑھئے۔ ان شاء اللہ آپ فائدے میں رہیں گے۔ ویسے

لکھنے والے کو اپنے قلم کی کوتاہی، علم کے قصور، نگاہ کی درماندگی اور فکر کی نارسائی کا صرف اعتراف ہی نہیں، اچھی طرح احساس بھی ہے، اور اس کا یہی احساس اس کے لئے وجہ نجات ہے۔ اور اسی سے امیدواری توفیق ہے۔ اپنے بزرگوں سے دعاؤں کا ملتجی اور عام ناظرین سے حسن مطالعہ کا آرزومند ہوں۔

اس مختصر رسالہ کا ماخذ محترم بزرگ حضرت مولانا قمرالزماں صاحب زید مجدہم اور حضرت حافظ محمد زکریا صاحب فتحپوری مدظلہ کی مختصر تحریریں ہیں۔ جنھیں ان حضرات نے مرتب کیا تھا۔ اور وہ غیر مطبوعہ ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ معلومات حضرت مولینا قاری ولی اللہ صاحب مدظلہٗ اور ان کے برادر بزرگ حافظ عبدالمنان صاحب سے حاصل ہوئیں۔ باتیں سب انھیں حضرات کی ہیں۔ الفاظ میں نے تحریر کئے ہیں۔

اعجاز احمد اعظمی

۱۳ ؍ رجب سنہ ۱۴۱۶ھ

حضرت مولانا الحاج عبد القیوم صاحب نور اللہ مرقدہٗ

اہل علم کے درمیان شمالی ہند کا مشہور و معروف ضلع اعظم گڑھ کسی لحاظ سے محتاجِ تعارف نہیں ہے اس ضلع کی سرزمین نے علم و فن کے ایسے ایسے لعل و گہر پیدا کئے ہیں جن کی تابندگی و تابناکی سے ایک دنیا کو روشنی ملی، عرصۂ قدیم سے یہ ضلع اپنی مردم خیزی اور علم نوازی کے لئے معروف ہے، ذہانت و ذکاوت یہاں کا ایک فطری جوہر ہے۔ یہاں جس طرح علوم و فنون کی مختلف شاخوں اور متنوع شعبوں میں باکمال افراد پیدا ہوئے، اور دنیا والوں سے خراجِ تحسین وصول کیا، اسی طرح درویشی و مشیخت اور بزرگی و ارشاد کی مسند ہدایت پر بھی ایک سے بڑھ کر ایک ہستیاں جلوہ گر ہوئیں۔ اور خدا سے بھٹکی ہوئی انسانیت کو خدا کے حضور تک پہونچانے میں سرگرم و ساعی رہیں۔ ایسے بزرگوں کی ایک فہرست ہے تاریخ اور تذکروں کی کتابوں میں ان شخصیات و افراد کے کچھ ہلکے اور کچھ گہرے نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔

اب یہ ضلع دو حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ ایک حصہ اپنے سابق نام اعظم گڑھ پر قائم ہے، دوسرا حصہ ضلع مئو کے نام سے موسوم ہوا۔ پچھلے کتنے ایسے عالم و بزرگ ہیں، جو اعظم گڑھ کی نسبت سے پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن ان کا مرز بوم وہ خطہ ہے جو اب ضلع مئو کا جز ہے، کبھی ضلع اعظم گڑھ، جونپور کا ایک جز تھا، یہاں کے نہ جانے کتنے نامورانِ علم و فضل ہیں، جو جونپور کی نسبت سے آج بھی معروف ہیں۔

ٹھیک یہی قصہ اب ضلع مئو کے ساتھ ہو رہا ہے، مئو کی بڑی بڑی باکمال ہستیاں اعظم گڑھ کے ساتھ منسوب ہو رہی ہیں۔

فتحپور:۔

سابق اعظم گڑھ ضلع کے مشرقی خطا اور شہر مئو سے شمال مغرب میں نرجا نامی ایک وسیع و عریض جھیل ــــ جس کو وہاں کے عرف میں تال کہتے ہیں ــــ کے شمالی ساحل پر ایک گاؤں فتحپور نامی واقع ہے۔ تال کی مناسبت سے یہ گاؤں فتحپور تال نرجا کے نام سے موسوم ہے۔ یہ ایک غیر معروف اور گمنام گاؤں تھا۔ جسے مصلح الامت عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے وجود مسعود نے شہرت دوام بخشی۔

اس بستی کو فتح خاں نامی بزرگ نے جو حضرت کے اور مولانا عبد القیوم صاحب کے اجداد میں تھے۔ آباد کیا تھا۔ اسی مناسبت سے اس کا نام فتحپور ہے۔ فتحپور کے آس پاس میلوں تک مسلمانوں کی آبادیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ گھوسی۔ کوپاگنج، پورہ معروف، ندوہ سرائے، کوڑیا پار، حمید پور، کاری ساتھ اس علاقے کی معروف مسلم آبادیاں ہیں۔

مولانا کا تعلق ایک نو مسلم مگر قدیم الاسلام راجپوت خاندان سے ہے۔ جس نے حلقہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد اپنی فطری شجاعت و بسالت کی مناسبت سے اپنے لئے خان کا لقب تجویز کیا، یہ خاندان اس علاقہ کی بہت سی آبادیوں میں پھیلا ہوا ہے۔

راجپوتوں کا یہ خانوادہ، قدیم راجپوتانہ کا باشندہ تھا، راجپوتانہ میں جب اسلامی فوجیں اپنے قدم جما رہی تھیں، اسی زمانہ میں یہ خاندان وہاں سے فرار ہو کر اس علاقہ میں پناہ گزیں ہوا تھا۔ کون جانتا تھا کہ جس دین و مذہب سے بھاگ کر

وہ صعوبتیں جھیلتے ہوئے پورب کے علاقہ میں آرہے ہیں۔ یہاں اسی مذہب نے ان کیلئے اپنی آغوش کھول رکھی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس خاندان کو پورب کی یہ سرزمین پسند آئی، اور یہیں اس نے طرح اقامت ڈال دی، چند پشتوں کے بعد اسی خاندان کا ایک خوش قسمت فرزند، کنور سنگھ طالع آزمائی کے لئے کھڑا ہوا۔ راج بھروں سے مقابلہ تھا۔ مدد حاصل کرنے کے لئے، کنور سنگھ سنہ ۸۳۳ھ میں ابراہیم شاہ شرقی فرمانروائے جونپور کے دربار میں پہونچا۔ وہاں جو اس نے اسلام کا صاف ستھرا رنگ دیکھا، علم اور علماء کی بارونق مجلسیں پائیں۔ مشائخ وصوفیاء کے ایمان افروز اور روح پرور حلقوں میں پہونچا، دینداری، سچائی اور اخلاص ودیانت کی خوشبو ہر طرف رچی بسی دیکھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی توفیق نے اس کے دل کے دروازوں کو کھولا، تو ایمان کا نور اس میں داخل ہوگیا۔ یہی وہ خوش نصیب ہے، جس نے اپنے خاندان میں سب سے اسلام کی برکت حاصل کی دربار شرقی میں اس کا نام "ملک دیندار" تجویز ہوا، ازلی سعادت نے قسمت میں یہ دولت بیدار لکھ رکھی تھی، ظاہری دشمن کے مقابلہ میں کمک حاصل کرنے گئے تھے، اور لوٹے تو کیا ظاہری اور کیا باطنی سب دشمنوں پر مظفر ومنصور ہوئے[1]

حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب، انھیں ملک دیندار کی اولاد میں ہیں۔

سلسلۂ نسب جو حضرت قاری ولی اللہ صاحبؒ مدظلہ کے برادر بزرگ حافظ عبدالمنان صاحب سے حاصل ہوا۔ وہ یہ ہے:

۱ــــ مولانا عبدالقیوم صاحب علیہ الرحمۃ۔
۲ــــ حافظ محمود خاں صاحبؒ۔
۳ــــ جنابؒ قاسم علی خاں صاحب۔

---

[1] عنوان فتحپور سے یہاں تک "حیات مصلح الامت" سے بعض الفاظ کے تغیر کے ساتھ ماخوذ ہے۔

۴ــــ جنابؒ ہیلا خاں صَاحب۔
۵ــــ جنابؒ ذوالفقار خاں صَاحب۔
۶ــــ جنابؒ فتح خاں صَاحبؒ۔
۷ــــ جنابؒ حکیم خاں صَاحب۔
۸ــــ جنابؒ سیف اللہ خاں صَاحب۔
۹ــــ جنابؒ فیروز خاں صَاحبؒ۔
۱۰ــــ جناب جتن خاں صَاحب۔
۱۱ــــ جنابؒ ملک فتح خاں صَاحب۔
۱۲ــــ جنابؒ ملک مبارک خاں صَاحب۔
۱۳ــــ جنابؒ ملک اودھن خاں صَاحب۔
۱۴ــــ جنابؒ ملک دیندار خاں صَاحب۔

حضرت مصلح الامتؒ کا نسب نامہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیف اللہ خانصاحب کے دو فرزند تھے، ایک پہاڑ خاں، جن کی اولاد میں حضرتؒ ہیں، اور دوسرے حکیم خاں جن کی نسل سے مولانا عبدالقیوم صَاحب۔ اس طرح سیف اللہ خاں پر ہر دو حضرات کا نسب متحد ہو جاتا ہے۔

ولادتؒ:

اسی فتحپور گاؤں میں مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صَاحبؒ نور اللہ مرقدہٗ کی اس عالم شہود میں تشریف آوری کے چھ، سات سَال بعد حافظ محمود خاں صَاحب کے یہاں سنہ ۱۳۱۹ھ مطابق سنہ ۱۹۰۱ء میں ایک بلند اقبال بچہ تولد ہوا۔

والد کے حافظ ہونے کا مطلب ہی یہ تھا کہ نہایت دیندار اور متقی و پرہیزگار

تھے، یہ بزرگ اس دور کے تھے جب حافظ ہونا، اور دیندار ہونا، حاجی ہونا، اور پرہیزگار ہونا، دو الگ شخصیتوں کے معنی میں نہیں تھا۔ اس وقت جو حافظ ہوا۔ لازم ہے کہ خلاف دین تمام امور سے کلی طور پر اجتناب کرتا ہو۔ وہ خواہ کاشتکار ہو یا تاجر دستکار ہو یا ملازم، جو کچھ بھی ہو وہ بعد میں ہوتا، اس سب سے پہلے دیندار ہوتا۔ باپ تو دیندار تھے ہی، ماں بھی تقویٰ و طہارت سے آراستہ تھیں، دیندار باپ اور متقی ماں کی آغوش میں پرورش پانے والا بچہ اگر ابتدا عمر ہی سے تدین اور تقویٰ کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہو، تو کچھ حیرت کی بات نہیں۔

نشوونما اور تعلیم:

ماں اور باپ دونوں کا وجود گرامی، آئندہ زندگی میں دینداری اور صلاح و تقویٰ کی ضمانت تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کی تربیت کے انداز نرالے ہیں۔ کسی کو ماں باپ کے واسطے سے ترقیات سے نوازتے ہیں، اور کسی کسی کی کفالت براہ راست، بغیر ماں باپ کے سایۂ عاطفت کے خود فرماتے ہیں۔ مولانا مرحوم ابھی پانچ چھ سال کے ہوئے تھے کہ ماں کا سایۂ شفقت اٹھ گیا۔ دس سال کی عمر ہوئی تھی کہ والد صاحب بھی جوار رحمت میں بلا لئے گئے۔ اب یہ بچہ یتیم و لیسیر ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسے بچے جو ماں کی شفقت سے بھی محروم ہو چکے ہوں، اور باپ کی تربیت سے بھی دور ہو چکے ہوں، ان کے بگڑنے میں عموماً دیر نہیں لگتی، روک ٹوک کرنے والے نہیں ہوتے بچوں کا منہ جدھر اٹھتا ہے۔ چل دیتے ہیں۔ مگر حق تعالیٰ کا یہ انتظام تھا کہ والد کی وفات کے بعد ان کے ایک بڑے بھائی تھے، داروغہ عبد اللطیف خانصاحب مرحوم، جو خود بھی حافظ قرآن تھے، انھوں نے اپنی کفالت اور تربیت میں اپنے ہونہار بھتیجے کو لے لیا۔ انھوں نے بھتیجے کی بہترین تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔

جو لوگ آگے چل کر کچھ بننے والے ہوتے ہیں۔ اور جنھیں اللہ تعالیٰ نوازنا چاہتے ہیں۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ ابتداء ہی سے ان کے اوپر کچھ خاص آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ حضرت سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

بالائے سرش ز ہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

اس کے سر کے اوپر ہوشمندی کی عمر ہی سے عروج و اقبال کا ستارہ جگمگا رہا تھا۔

مولانا عبدالقیوم صاحبؒ کے بارے میں دیکھنے والوں کی شہادت ہے کہ بچپن ہی سے ان کے انداز و اطوار عام بچوں سے الگ تھلگ تھے، دیہاتی ماحول میں بچوں کا حال بیشتر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اپنے ہم جولیوں میں غول در غول کھیل کود میں مشغول رہتے ہیں، کھیتوں اور باغوں میں دند مچاتے ہیں۔ فتحپور میں تو گھر کے بالکل کنارے نرجا نامی طویل و عریض تال ہے۔

جو بستیاں ندی اور تال کے ساحل پر ہوتی ہیں۔ وہاں کے بڑوں کا بھی اور بچوں کا بھی دلچسپ اور محبوب مشغلہ مچھلیاں پکڑنا اور تال میں آنے والی چڑیوں کا شکار کرنا ہوا کرتا ہے، لیکن دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ مولانا ان مشاغل اور ان دلچسپیوں سے دور رہتے تھے، جیسے ہی حروف شناسی کی عمر ہوئی، والدین نے پڑھنے میں لگا دیا۔

مولانا مرحوم کے ابتدائی استاذ حضرت حافظ حفیظ اللہ صاحب مرحوم تھے۔ یہ بزرگوار حضرت حافظ ولی محمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے بڑے صاجزادے تھے۔ حافظ ولی محمد صاحب موصوف، مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے استاذ تھے، یہ حافظ صاحبؒ بھی تا زندگی بچوں کی تعلیم و تربیت میں مشغول

رہے۔

حافظ صاحب کام تو معلم الصبیانی ہی کا کرتے تھے، جس سے بظاہر گمان ہوتا ہے کہ آج کل کے مکتب کے میانجی کی طرح کے ایک آدمی رہے ہوں گے۔ لیکن ان کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک صاحب نسبت بزرگ تھے، فتحپور سے کچھ میل کے فاصلے پر ایک بستی بھیرہ نامی ہے، یہ عرصۂ قدیم سے بزرگوں اور اللہ والوں کی آبادی رہی ہے شاہ ابوالخیر، شاہ ابوالغوث گرم دیوان شاہ جیسے خدارسیدہ بزرگ یہیں کے رہنے والے تھے، اخیر دور میں یہاں کی خاک سے حضرت مولانا شاہ علی احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۳۱۷ھ جیسے صاحب نسبت اور صاحب رشد و ہدایت بزرگ اٹھے، جن سے بڑے بڑے علماء نے فیض حاصل کیا، حضرت حافظ صاحب موصوف انھیں مولانا علی احمد صاحب کے دامن فیض سے وابستہ تھے، حافظ صاحب نے فتحپور میں عرصہ تک بچوں کو درس دیا، اور ان کی دینی تربیت فرمائی، اس گاؤں میں حفظ قرآن کا ذوق ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھیں کی توجہات کا اثر ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے والد محترم بھی حافظ تھے، حضرت کے بڑے بھائی جناب عبدالعلیم صاحبؒ حافظ تھے، مولانا عبدالقیوم صاحب کے والد مکرم حافظ تھے بعد میں حضرت مصلح الامتؒ کی دینی واصلاحی سرگرمیوں اور کاوشوں کی وجہ سے یہ ذوق خوب نکھرا، گھر کا گھر اور خاندان کا خاندان حفظ قرآن کریم کی دولت سے مالا مال ہونے لگا۔

مولانا عبدالقیوم صاحبؒ نے گیارہ سال کی عمر میں حفظ قرآن کی تکمیل کرلی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پڑھنے کا خاص ذوق وشوق اور حافظ کی بہترین قوت سے انھیں نوازا تھا۔ حفظ قرآن سے فراغت کے بعد آگے کی تعلیم کی فکر ہوئی

کانپور کا سفر:

اس وقت فتحپور کے نوجوان علماء میں حضرت مولانا محمد عثمان صاحب علیہ الرحمہ کا نام بہت نمایاں تھا۔ مولانا محمد عثمان صاحب دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب نور اللہ مرقدہ کے خاص تلامذہ میں سے تھے، شیخ الہند کی تحریک جہاد، جو ریشمی رومال تحریک کے نام سے مشہور ہوئی، اس کے خصوصی رکن تھے، اور حضرت کے حکم سے بھیس بدل کر ایک مرتبہ افغانستان کا سفر بھی کیا تھا (اس کی تفصیل تذکرۂ علماء اعظم گڑھ میں ملاحظہ فرمائیں۔)

حضرت مولانا محمد عثمان بن محمد شریف خاں علمائے اعظم گڑھ کے زمرہ میں جامع المعقولات والمنقولات عالم تھے، ان کی ولادت سنہ ۱۲۹۹ھ میں ہوئی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اس کے بعد جونپور جاکر حافظ محمد جعفر کی خدمت میں حفظ قرآن کی دولت حاصل کی۔ اس کے بعد تعلیمی سلسلہ منقطع کر کے خاندانی روایات کے مطابق فیض آباد پولیس میں بھرتی ہو گئے۔ حسن اتفاق وہاں ایک بزرگ سے ملاقات ہو گئی انھوں نے مولانا کو دیکھتے ہی فرمایا کہ تمہاری پیشانی پر علم کا نور چمک رہا ہے، ان کے اس جملہ نے مولانا کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا، ملازمت سے دل سرد پڑ گیا، اور پولیس کی ملازمت سے مستعفی ہو کر تحصیل علم کی غرض سے کانپور چلے گئے، اور جامع العلوم کانپور میں داخلہ لے لیا۔ متوسطات تک کانپور میں تعلیم حاصل کی۔ پھر دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، حضرت شیخ الہند سے بخاری و ترمذی پڑھ کر سنہ ۱۳۲۹ھ میں فراغت حاصل کی۔

تعلیم و تحصیل سے فراغت کے بعد مدرسہ ضیاء العلوم کانپور میں تدریسی خدمت پر مامور ہوئے، لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد وہاں سے علیحدہ ہو گئے کچھ دنوں گوالیار میں ایک مدرسہ میں مدرس رہے، لیکن کانپور کی کشش دوبارہ کھینچ لائی۔

اور وہاں خود ایک درسگاہ اشرف العلوم کے نام سے قائم کی۔ اس مدرسے نے بہت ترقی حاصل کی سیکڑوں علماء و فضلاء اس سے فیضیاب ہو کر نکلے۔

مولانا محمد عثمان کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ انھوں نے چوبیس سالہ تدریسی زندگی میں کبھی معاوضہ نہیں قبول کیا اور تاحیات لوجہ اللہ علمی و دینی خدمت کرتے رہے، مولانا جملہ علوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، بالخصوص فقہ میں آپ کو درجۂ اختصاص حاصل تھا۔

مولانا محمد عثمان صاحب نے پچپن برس کی عمر میں ۱۴ر محرم سنہ ۱۳۵۶ھ کو اپنے آبائی وطن فتحپور تال نرجا میں وفات پائی اور اپنے آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

(تذکرۂ علمائے اعظم گڑھ ص ۲۹۰)

مولانا موصوف اس وقت کانپور میں مدرس تھے، انھیں پڑھانے اور طلبہ کی تعلیم و تربیت کا خاص ذوق تھا، حضرت مصلح الامت کو بھی مولانا ہی اپنی طالب علمی کے دور میں ابتداءً کانپور لے گئے، پھر جب دیوبند جانے لگے تو اپنے ساتھ دیوبند لے گئے، سرپرستوں نے مولانا عبد القیوم کو انھیں مولانا محمد عثمان کے حوالے کر دیا۔ مولانا انھیں سنہ ۱۳۲۳ھ میں کانپور لے گئے، مولانا محمد عثمان صاحب نے نہایت محنت و کاوش کے ساتھ ان کی خصوصی تعلیم و تربیت کا اہتمام فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس طالب علم کو ذوقِ علم، جذبۂ محنت اور ذہانت و ذکاوت سے نوازا تھا۔ بالکل یکسوئی سے حصول علم میں منہمک رہے، طالب علمی کی منزلیں طے ہوتی رہیں۔ تاآنکہ سنہ ۱۳۴۱ھ میں تمام کتب درسیہ کی تکمیل کر لی، اور اسی سال حکیم الامت، مجدد الملت، حضرت اقدس مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کے مبارک ہاتھوں سے دستار فضیلت سر پر بندھوائی۔

امتحان بھی حضرت حکیم الامت ہی نے لیا تھا۔ حضرت مولانا محمد عثمان صاحب

علیہ الرحمۃ نے مدرسہ کی جانب سے جو سند فراغ عطا فرمائی ہے۔ اس پر حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے بھی دستخط ہیں۔ اس میں حضرت الاستاذ نے جو الفاظ اپنے شاگرد کے متعلق تحریر فرمائے ہیں۔ وہ قابل ملاحظہ ہیں۔ تحریر فرماتے ہیں۔

ولم یزل فی اوان تحصیل العلوم، بقیم وظائف المدارسة والرسوم، من التدریس والامتحان، والافتاء والوعظ بالسنة والقرآن۔ فهو بحمد الله تعالیٰ شاب صالح ذو فضائل جلیلة واخلاق جمیلة، حری بان عمم بعمامة الفضیلة۔ بحضرة العلماء الکرام والمشائخ العظام۔

عزیز موصوف زمانۂ طالب علمی میں مدرسے کے قوانین وضوابط کے پورے پابند تھے، جن میں پڑھانا، امتحان دینا، فتویٰ نویسی، اور قرآن وسنت کا وعظ کہنا وغیرہ داخل ہیں۔ وہ خدا کے فضل سے نوجوان صالح ہیں، بلند فضائل اور عمدہ اخلاق کے مالک ہیں۔ وہ اس کے مستحق ہیں کہ علماء کرام اور مشائخ عظام کی موجودگی میں دستار فضیلت سے نوازے جائیں۔

یہ استاذ کی جانب سے ایک وقیع شہادت ہے، جس کی قدر وقیمت حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے دستخط نے بہت بڑھادی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ حضرت تھانویؒ کس قدر محتاط تھے۔

سند کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم طالب علمی کے دور میں طلبہ کو پڑھاتے بھی تھے، فتاوے بھی لکھتے تھے اور وعظ بھی کہا کرتے تھے، قدیم مدارس میں رواج تھا کہ جن طالب علموں پر اساتذہ کو اعتماد ہوتا تھا۔ انھیں نیچے کی کتابیں سپرد کردیا کرتے تھے۔ وہ بیک وقت اپنے اساتذہ سے پڑھتے بھی تھے، اور اپنے سے نیچے کی جماعتوں کو پڑھاتے بھی تھے، ان سے فتویٰ نویسی اور وعظ کا

بھی کام لیا جاتا ہے۔ مولانا مرحوم میں یہ سب صلاحیتیں بیک وقت جمع تھیں۔ چنانچہ ان سے یہ سب کام دورِ طالب علمی میں ہی لئے گئے۔

کتابیں، جو مولانا نے کانپور میں پڑھیں۔

اس سند میں ان کتابوں کے نام بھی تفصیلاً ذکر کئے گئے ہیں، جو مولانا مرحوم نے پڑھی تھیں یہ کتابیں وہی ہیں، جو درس نظامیہ میں شامل ہیں۔ لیکن اب ان میں سے بہت سی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے کا رواج اسطرح موقوف ہوگیا ہے کہ موجودہ دور کے بہت سے فاضلین کو ان کے نام تک معلوم نہیں ہیں۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ان کتابوں کے نام یہاں تحریر کردیں۔

۱ — تفسیر بیضاوی۔ ۲ — تفسیر جلالین ۳ — صحیح بخاری شریف۔
۴ — مسلم شریف۔ ۵ — سنن ابوداؤد ۶ — سنن نسائی۔
۷ — سنن ابن ماجہ۔ ۸ — سنن ترمذی ۹ — موطا امام مالک۔
۱۰ — موطا امام محمد۔ ۱۱ — مشکوٰۃ المصابیح ۱۲ — نخبۃ الفکر
۱۳ — ہدایہ ۱۴ — شرح وقایہ ۱۵ — قدوری
۱۶ — منیۃ المصلی۔ ۱۷ — سراجی ۱۸ — مقدمہ شیخ عبدالحق۔
۱۹ — مسلم الثبوت ۲۰ — التوضیح والتلویح ۲۱ — نورالانوار
۲۲ — اصول الشاشی ۲۳ — شمس بازغہ ۲۴ — میبذی
۲۵ — شرح ہدایۃ الحکمہ لصدرالدین ۲۶ — شرح السلم للقاضی مبارک
۲۷ — شرح السلم لحمداللہ ۲۸ — میرزاہد رسالہ مع غلام محی الدین۔
۲۹ — میرزاہد مع ملا جلال ۳۰ — میرزاہد امور عامہ ۳۱ — شرح مواقف
۳۲ — تحریر اقلیدس ۳۳ — مناظرہ رشیدیہ ۳۴ — رسالہ عضویہ

۳۵ ـــــ شرح عقائد نسفی

۳۶ ـــــ حاشیہ خیالی

۳۷ ـــــ قطبی

۳۸ ـــــ میر قطبی

۳۹ ـــــ شرح تہذیب

۴۰ ـــــ تہذیب

۴۱ ـــــ مرقاۃ

۴۲ ـــــ قال اقول

۴۳ ـــــ صغری

۴۴ ـــــ کبری

۴۵ ـــــ شرح چغمینی

۴۶ ـــــ تصریح

۴۷ ـــــ مطول

۴۸ ـــــ مختصر المعانی

۴۹ ـــــ شرح جامی

۵۰ ـــــ کافیہ

۵۱ ـــــ ہدایۃ النحو

۵۲ ـــــ شرح مایۃ عامل

۵۳ ـــــ مایۃ عامل

۵۴ ـــــ نحو میر

۵۵ ـــــ فصول اکبری

۵۶ ـــــ صرف میر

۵۷ ـــــ پنج گنج

۵۸ ـــــ زبدہ

۵۹ ـــــ منتخب

۶۰ ـــــ میزان الصرف

۶۱ ـــــ دیوان متنبی

۶۲ ـــــ جمل

۶۳ ـــــ مقامات حریری

۶۴ ـــــ سبعہ معلقہ

اس سند پر درج ذیل علماء و مشائخ کے دستخط ہیں۔

۱ ـــــ حکیم الامت حضرت اقدس مولانا شاہ اشرف علی تھانوی قدس سرہ۔

۲ ـــــ استاذ محترم حضرت مولانا محمد عثمان صاحب فتحپوری علیہ الرحمۃ

۳ ـــــ حضرت مولانا محمد عثمان صاحب حنفی علیہ الرحمۃ۔

۴ ـــــ حضرت مولانا افضل علی صاحب بارہ بنکوی علیہ الرحمۃ۔

۵ ـــــ حضرت مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب کاندھلوی علیہ الرحمۃ۔

۶۔ حضرت مولانا محمد وصی علی ملیح آبادی علیہ الرحمۃ۔

۷۔ حضرت مولانا محمد خاں علیہ الرحمۃ۔

۸۔ حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب اعظمی علیہ الرحمۃ۔

۹۔ حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادی علیہ الرحمۃ۔

اوپر جو (۶۴) کتابوں کے نام درج کئے گئے ہیں، انھیں مولانا نے سنہ ۱۳۳۳ھ سے سنہ ۱۳۴۱ھ کی مدت میں پڑھا ہے۔ آٹھ سال کی مدت میں ۶۴ر کتابیں۔ یعنی سالانہ آٹھ کتابیں۔

بچپن کے ساتھی اور تحصیل علم کے رفیق مولانا ریاست علی کوٹی فرماتے تھے کہ

> "مولانا طالب علمی ہی کے زمانے میں نہایت صالح تھے، جھگڑے فساد اور لغویات میں بالکل نہ رہتے تھے اور پڑھنے میں بہت محنت کرتے تھے"۔

اسی کا اثر تھا کہ مولانا کی درسی اور تدریسی استعداد نہایت اعلیٰ تھی، جس کا ظہور آپ کے تلامذہ میں ہوا۔

تدریس:۔

ذی استعداد طلبہ جو طالب علمی کے زمانے میں تیز رفتاری سے ترقی کرتے ہیں۔ اگر پڑھنے کے بعد تدریس کے ساتھ وابستہ ہوجائیں تو ان کی استعداد علمی راسخ ہوجاتی ہے، اسی لئے حضرات اساتذہ اپنے ذکی و ذہین تلامذہ کے بارے میں ہمیشہ اس کے خواہشمند رہتے ہیں کہ انھیں ایک معتد بہ مدت تک تمام علوم وفنون کی کتابیں پڑھانے کا موقع مل جائے، اس سے علم میں نکھار پیدا ہوجاتا ہے، مولانا نے جس خوبی اور عمدگی کے ساتھ کتابوں اور علوم کی استعداد بہم پہونچائی تھی، ضروری تھا۔

کہ اسے کام میں لایا جاتا، اس وقت کانپور میں بارہ بنکی کے طلبہ بہت رہا کرتے تھے۔ بارہ بنکی کا کانپور سے خصوصی ربط تھا۔ استاذ محترم کے ایما پر مولانا عبدالقیوم صاحب بارہ بنکی تشریف لے گئے، بارہ بنکی کے محلہ بیگم گنج میں ایک مدرسہ تھا، اس میں تشریف لے گئے۔

مولانا بارہ بنکی میں دس سال تک تعلیم وتدریس میں منہمک رہے، اس دوران تمام کتب درسیہ از اول تا آخر آپ کے زیر درس رہیں، آپ سے بخاری شریف اور دوسری کتب حدیث پڑھ کر متعدد علماء نے فراغت حاصل کی۔

انداز تدریس:

مولانا تدریس کے میدان میں مجتہد تھے، بالخصوص صرف نحو کی کتابیں اور اس کے مسائل پڑھانے اور انھیں مستحضر کرادینے کا ان کا ایک منفرد انداز تھا، وہ صرف ونحو کی صرف کتابی تعلیم نہیں دیتے تھے، بلکہ ہر ہر قاعدہ اور اصول کی مثالوں کے ساتھ مشق کرایا کرتے تھے، اور عربی عبارت پڑھنے کا خصوصی ملکہ پیدا کردیتے تھے، اس طریقۂ تعلیم میں استاذ کو سخت جانکاہی کرنی پڑتی ہے۔ قواعد تو خیر عموماً یاد ہوتے ہیں۔ مگر ان کی مثالوں کو کثرت سے یاد رکھنا، انھیں طلبہ کے سامنے پیش کرنا، ان پر قواعد کا اجرا اور انطباق کرانا۔ پھر طلبہ کی نارسائی اور غلط جواب پر صبر کرنا، اور پھر بار بار ان کا اعادہ کر کے طلبہ کے ذہن نشین کرانا، بڑا وقت طلب کام ہے۔ استاذ کو جب تک محنت وکاوش کا ذوق نہ ہو، اور طالب علموں پر غایت درجہ شفقت ومہربانی نہ ہو، اس طریقۂ تعلیم پر ہرگز قائم نہیں رہ سکتا، لیکن اس طریقۂ تعلیم کا بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علموں کے لئے عبارت خوانی اور اس سے مطلب فہمی بالکل سہل ہوجاتی ہے۔ ابتدا میں یہ محنت کردی

جائے تو بعد میں بڑی کتابوں میں استاذ کی محنت آدھی سے بھی کم ہو جاتی ہے۔

مولانا کے پڑھائے ہوئے طلبہ جب دوسرے بڑے مدارس میں جاتے، تو وہاں اساتذہ کے درس میں عبارت خوانی میں ممتاز ہوتے۔ اس سے انھیں اپنے بڑے اساتذہ کی خاص عنایت و توجہ حاصل ہوتی، مولانا کے گرامی قدر صاحبزادے مولانا قاری ولی اللہ صاحبؒ نے بھی صرف و نحو نیز عبارت خوانی کی مشق اپنے والد محترم کی خدمت میں کی ہے، جب تعلیم کی تکمیل کے لئے مظاہر علوم سہارنپور پہونچے، تو ان کی صحت عبارت سن کر حضرات اساتذہ بالخصوص شیخ الحدیث حضرت مولٰنا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہٗ اور حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور علیہ الرحمہ نے خصوصی توجہ مبذول فرمائی، یہ حضرات دریافت فرماتے کہ عبارت پڑھنے کا یہ ملکہ اور نحوی صرفی باریکیوں پر یہ نظر کہاں سے حاصل ہوئی۔ وہ جب اپنے والد گرامی کا نام بتاتے تو یہ حضرات ان کے فضل و کمال کا اعتراف کرتے۔

طلبہ کے حق میں مولانا بہت مہربان اور شفیق تھے، بالخصوص پڑھانے، بلکہ علم کو گھول کر پلا دینے کے بڑے حریص تھے، ان کی مہربانی اور شفقت کا اثر تھا کہ طلبہ ان کے بہت گرویدہ رہتے، جن لوگوں نے ان سے بارہ بنکی میں پڑھا تھا، حالانکہ عرصہ گزر چکا تھا، مگر بعض بعض حضرات، ان سے محض ملاقات کی غرض سے فتحپور آیا کرتے تھے۔

جین پور اور فتحپور میں

دس سال بارہ بنکی میں خدمت کی۔ پھر اللہ کو منظور ہوا کہ فیض کے اس سرچشمہ سے وطن اور قرب وجوار کے لوگ مستفید ہوں۔ حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ مولانا کو گھر پر ٹھہرنا ضروری ہو گیا۔ ۱۹۵۲،۵۳ء کے لگ بھگ آپ نے

گھر پر رہنے کا فیصلہ کیا۔

اس کی صورت یہ ہوئی کہ حضرت اقدس تھانوی قدس سرہٗ کے حکم سے حضرت مصلح الامت نے جب فتحپور میں کام کرنے اور وہاں قیام کرنے کا ارادہ کیا، تو تھانہ بھون سے حضرت بارہ بنکی تشریف لائے۔ اور مولانا عبدالقیوم صاحب سے فرمایا کہ میرا ارادہ فتحپور میں رہنے اور کام کرنے کا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی ساتھ چلیں، آپ وہاں مدرسہ چلائیں۔ اور میں اپنا کام کروں گا۔ حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب بے تامل اور بغیر عذر کے آمادہ ہو گئے۔ اور وطن تشریف لائے، پھر مولانا موصوف کا مکان اور بنگلہ بیک وقت مدرسہ تھا، خانقاہ تھا، اور رہائش گاہ بھی، بعد میں حضرت نے اپنا مکان بنایا، اور خانقاہ بنوائی۔ اور مدرسے کے لئے الگ زمین حاصل ہو گئی، یہی مدرسہ انوار العلوم کے نام سے موسوم ہوا۔ بعد میں اسی کا نام وصیۃ العلوم قرار پایا۔

اس وقت مولانا کی تنگدستی اور عسرت کا دور تھا۔ اسی دوران تھوڑے وقفے کے لئے، جین پور مدرسہ جامع العلوم میں بھی تشریف لائے، یہ مدرسہ مولانا ہی کے ہم وطن اور رفیق مولانا عبدالحکیم صاحب مرحوم نے قائم کیا تھا۔ لیکن وہاں قیام صرف چند ماہ رہا۔ اس کے بعد پھر وطن واپس آ گئے، اور تادم آخر وہاں سے نہیں نکلے، حالانکہ متعدد مدارس والے خواہشمند رہے۔

عام طور سے جید الاستعداد علماء اور طلبہ اپنے لئے خدمت کا وہ میدان تلاش کرتے ہیں، جہاں ان کی علمی صلاحیتوں کو بلند پروازی کی فضا مل سکے، چنانچہ وہ بڑے مدارس کا یا بڑے شہروں کا رخ کرتے ہیں، اور یہ جذبہ کچھ برا نہیں ہے، اس طرح خدمت علم دین کی انھیں وسیع دنیا مل جاتی ہے، وہ بڑے اہم امور سرانجام کر لیتے ہیں۔ تاہم اس خیر کے باوجود اس میں ایک کمی اکثر محسوس ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ یہ حضرات اپنی بلند پروازی میں اتنی دور نکل جاتے ہیں کہ خود ان کے وطن اور خاندان کے

ناخواندہ اور دین سے پسماندہ لوگ ان سے کماحقہ فائدہ نہیں اٹھا پاتے، باہر کی دنیا ان سے فیض پاتی ہے، لیکن وطن اور قرب وجوار کے لوگ ان کے فوائد سے محروم رہتے ہیں۔ چنانچہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بڑے بڑے علماء جن سے عالم میں فیض پہنچا انھیں جب ان کے وطن میں دیکھا گیا، تو یکہ و تنہا ملے، ان سے فائدہ اٹھانے والے کم ملے، ظاہر ہے کہ اہل وطن کا حق زیادہ ہوتا ہے، جہاں بچپن گزرا، جہاں کی فضاؤں میں معصومیت کا دور گزارا، جن لوگوں کے درمیان رہ کر شعور کی عمر کو پہونچے، جب وہ وقت آیا کہ وہ لوگ کچھ فائدہ اٹھائیں تو شمع اٹھا کر دوسری انجمن میں رکھ دی گئی۔ اور یہاں جیسے پہلے اندھیرا تھا۔ اب بھی اندھیرا ہی رہا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ احساس ہمارے اکابر علماء کو برابر رہا کیا ہے، چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی علیہ الرحمہ پاؤں جما کر گنگوہ میں بیٹھ رہے۔ حضرت تھانوی علیہ الرحمہ نے ابتداءً کانپور میں پڑھایا۔ اور چودہ پندرہ سال تک وہاں رہے، کانپور سے حضرت کو ایسا انس ہو گیا تھا کہ اس کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں آتا تھا۔ گویا وطن ثانی بن گیا تھا۔ مگر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ اگر کانپور سے تعلق ختم ہو تو کہیں اور مت تعلق کرنا، تھانہ بھون میں بیٹھ جانا، حضرت سوچتے تھے کہ کانپور سے تعلق ختم کرنے کا تصور ہی کب ہوگا۔ لیکن جب طبیعت اچاٹ ہوئی، تو گو گرد و پیش میں بڑی بڑی جگہیں تھیں، اگر کہیں آپ قیام منظور کرتے تو لوگوں کو نہایت خوشی ہوتی مگر یکسوی کے ساتھ تھانہ بھون میں بیٹھ کر مصروف خدمت ہو گئے۔

حضرت مولانا شاہ وصی صاحب قدس سرہٗ بھی کچھ عرصہ تک وطن کے باہر بعض مدرسوں میں خدمت کرتے رہے، لیکن بالآخر وطن میں آ گئے۔ اور عرصہ تک وہاں رہے، بعد میں اللہ تعالیٰ کو آپ کا فیض زیادہ عام کرنا مقصود ہوا تو گورکھپور، الہ آباد اور بمبئی پہونچائے گئے۔

غرض ہمارے بزرگوں نے اس کا گونہ اہتمام کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو مصدر فیوض و برکات بنائیں، تو سب سے پہلا حق اہل وطن کو پہونچتا ہے، گو یہ بات بھی بالکل صحیح ہے کہ اہل وطن ہی فیض حاصل کرنے میں زیادہ کوتاہ ہوتے ہیں۔ فیض اٹھانے کیلئے شرط اول قلبی عظمت و محبت ہے۔ وطن والوں کو تو محبت کسی درجہ میں حاصل ہو جاتی ہے، مگر عظمت و عقیدت سے عموماً ان کے قلوب خالی ہوتے ہیں۔ جن لوگوں میں بچپن گزرا، جوانی کا دور گزرا، زندگی کے مختلف مراحل گزرے ایسے مراحل جن میں نگاہیں اپنے بھائی برادر کی ملکوتیت سے زیادہ بشریت اور اس کی کمزوریوں پر پڑتی ہیں۔ پھر ان سے تعلقات کی نیچ اونچ بھی رہا کرتی ہے۔ اور اس اونچ نیچ کا دائرہ صرف اس بزرگ کی ذات تک محدود نہیں رہتا۔ بلکہ اس کے خاندان اور متعلقین تک پھیلا ہوا رہتا ہے۔ اس لئے کسی بزرگ کی جیسی عظمت و عقیدت اہل وطن کو ہونی چاہیئے، نہیں ہو پاتی، اور باہر کے لوگ اس نشیب و فراز سے چونکہ یکسو رہتے ہیں، ان کے سامنے ان بزرگ کی زیادہ تر ملکوتی صفات ہوتی ہیں۔ اس لئے انھیں عقیدت و عظمت کا کمال حاصل ہو جاتا ہے۔

گھر اور وطن کے لوگوں کو مذکورہ بالا وجوہ سے ایک طرح کی بے نیازی رہتی ہے۔ اس بے نیازی اور بے وقعتی پر صبر کر کے محض اللہ کے لئے، محض دین کے لئے کام کرنا بڑا مشکل مجاہدہ ہے۔ ابتداءً یہ مجاہدہ حضرت مصلح الامت نے کیا اس کے بعد اس میں مولانا عبد القیوم صاحب کو بھی شریک کر لیا۔

مدرسہ انوار العلوم کا قیام

چنانچہ مولانا نے بھی طرح اقامت فتحپور ہی میں ڈال دی۔ زمینداری اور کاشتکاری تھی، مگر اس سے کچھ زیادہ مناسبت نہ تھی، نہ اسے زندگی کا موضوع

بناتا تھا۔ موضوع زندگی تو دین تھا، دین کی خدمت تھی، اس علم کی نشر واشاعت تھی، جس کی تحصیل میں بارہ چودہ سال اور جس کی تدریس میں دس سال اب تک کھپا چکے تھے، وطن میں تشریف لائے، تو یہاں اپنے اسی موضوع زندگی کے تحت ایک مدرسہ انوار العلوم کے نام سے قائم کیا، اس مدرسہ میں ناظرہ اور دینیات کی تعلیم کے ساتھ آپ نے حفظ قرآن کا خاص اہتمام کیا۔ اور اس خدمت کو خود اپنے ذمہ رکھا غور کرنے کی بات ہے کہ جس عالم نے برسوں درس نظامی کی ابتدائی اور انتہائی کتابوں کا نہایت تحقیق وتدقیق کے ساتھ کامیاب درس دیا ہو، اور اس کے حضور منتہی طلبہ نے زانوئے ادب تہ کیا ہو۔ اب وہ وطن میں آکر چھوٹے چھوٹے بچوں کو گھیر کر قرآن کریم حفظ کرا رہا ہے۔ قرآن کریم کا حفظ کرانا، بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے لیکن حفظ کے استاذوں سے کوئی پوچھے کہ یہ کیسا کوہ کندنی کا عمل ہے، میرے تجربے میں اس جیسا صبر آزما اور جگر گداز عمل شاید ہی اور کوئی، چھوٹے چھوٹے بچے ان کی بچپن کی لاپرواہیاں، سبق کا یاد نہ کرنا کسی لفظ کا غلط تلفظ زبان پر چڑھ گیا تو اس کا بڑی محنت کے بعد بھی نہ اترنا، پھر بچوں کی شرارتیں! استاذ کے صبر وضبط کا امتحان ہو جاتا ہے۔ اسی امتحان میں بعض لوگ پورے نہیں اترتے، تو بچوں کو بے تحاشا زدوکوب کرنے لگتے ہیں، حفظ کے بچوں کے زدوکوب کی ایک لمبی داستان ہے، لیکن استاذ صابر و متحمل ہوتا ہے، تو آہستہ آہستہ ان سب مرحلوں سے بخیر وخوبی گزر جاتا ہے۔ مولانا چونکہ فطرۃً طلبہ پر بہت شفیق ومہربان تھے، اس لئے نہایت دلسوزی کے ساتھ پڑھاتے تھے، آپ کی کوشش ومحنت سے بکثرت بچے حافظ کلام اللہ ہو ہو کر نکلنے لگے۔ صرف فتحپور میں ہی نہیں، اطراف ونواح میں بکثرت حفاظ تیار ہو گئے۔

مولانا نے صرف تحفیظ قرآن پر ہی اکتفا نہیں کیا، اس کے ساتھ فارسی و

عربی تعلیم کا سلسلہ بھی قائم کیا، چنانچہ حفظ کی تکمیل کے بعد بچے آپ سے عربی تعلیم شروع کرتے، اپنی خداداد حذاقت و مہارت کے باعث بہت جلد ان میں پختہ استعداد فرمادیتے۔ آپ سے ابتدائی تعلیم حاصل کرکے بچے دارالعلوم مئو، اور پھر وہاں سے سہارنپور یا دیوبند جاکر فراغت حاصل کرتے، یہ بچے جہاں پہونچتے اپنی پختہ استعداد کی دھاک بٹھادیتے۔ مولانا قاری ولی اللہ صاحب امام نور مسجد بمبئی اسی دور کے تلامذہ میں ہیں، قاری صاحب مدظلہٗ اور دوسرے بھائیوں نے شرح وقایہ تک آپ سے تعلیم حاصل کی۔

شاگردوں کی فہرست:

یہاں ہم مناسب سمجھتے ہیں مولانا کے شاگردوں کی ایک اجمالی فہرست درج کردیں۔ جنھوں نے آپ کی خدمت قرآن کریم کے حفظ کی سعادت حاصل کی۔ اور بعض نے عربی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ تلامذۂ فتحپور کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ حافظ قاری اسد اللہ صاحب
۲۔ حافظ قاری ابصار اللہ صاحب
۳۔ حافظ قاری عبدالسلام صاحب
۴۔ حافظ عبدالمنّان صاحب
۵۔ حافظ قاری ولی اللہ صاحب
۶۔ جناب حافظ فریدالدین صاحب
۷۔ جناب حافظ شمس الحق صاحب
۸۔ حافظ محب الحق صاحب
۹۔ حافظ محمد شکیل صاحب
۱۰۔ حافظ مسیح الدین صاحب
۱۱۔ حافظ وہاج الدین صاحب
۱۲۔ حافظ غیاث الدین صاحب
۱۳۔ حافظ ابوالکلام صاحب
۱۴۔ حافظ عبدالباری صاحب
۱۵۔ حافظ مسیح اللہ صاحب
۱۶۔ حافظ محمد شاہد صاحب
۱۷۔ حافظ عطاء اللہ صاحب
۱۸۔ حافظ محمد طفیل صاحب

۱۹ حافظ محمد یونس صاحب
۲۰ حافظ قمر الدین صاحب
۲۱ حافظ علیم الدین صاحب
۲۲ حافظ محمد یونس صاحب
۲۳ حافظ محمد یحییٰ صاحب عرف مٹھو
۲۴ حافظ مولوی وصی الدین صاحب
۲۵ حافظ شمس الدین صاحب
۲۶ حافظ محمد سہیل صاحب
۲۷ حافظ محمد اقبال صاحب
۲۸ حافظ وصی الدین صاحب
۲۹ حافظ محمد صالح صاحب
۳۰ حافظ محمد یحییٰ صاحب عرف گگن
۳۱ حافظ مقبول احمد صاحب
۳۲ حافظ حمید الدین صاحب
۳۳ حافظ مطیع اللہ صاحب
۳۴ حافظ محمد امین صاحب
۳۵ حافظ امان اللہ صاحب
۳۶ حافظ محب الحق صاحب
۳۷ حافظ ریاض احمد صاحب
۳۸ حافظ محمد سلیم صاحب
۳۹ حافظ محمد ادریس صاحب
۴۰ حافظ بہاء الدین صاحب
۴۱ حافظ محمد عقیل صاحب
۴۲ حافظ محمد مصطفےٰ صاحب
۴۳ حافظ محمد ادریس صاحب
۴۴ حافظ منصب علی صاحب
۴۵ حافظ محمد صغیر صاحب
۴۶ حافظ رسول صاحب
۴۷ حافظ محمد مجتبیٰ صاحب
۴۸ حافظ نیاز احمد صاحب

تلامذۂ کاری ساتھ

۴۹ حضرت حافظ قاری محمد مبین صاحب مدظلہ
۵۰ حافظ فرید الدین صاحب
۵۱ حافظ مسیح الدین صاحب
۵۲ حافظ قاری ثناء اللہ صاحب
۵۳ حافظ انوار الحق صاحب
۵۴ حافظ قاری محمد قربان صاحب

تلامذہ [illegible] درس پور

۵۵ حافظ علاء الدین صاحب
۵۶ حافظ منیر احمد صاحب
۵۷ حافظ قمر الدین صاحب

تلامذہ ندوہ سرائے

۵۸ــــ حافظ افتخار احمد صاحبؒ۔

یہ ایک اجمالی فہرست ہے۔ اللہ جانے ان کے علاوہ کتنے لوگ ہوں گے جنھوں نے مولانا سے کسب فیض کیا ہوگا۔

ذوقِ اصلاح:

حضرت مولانا مرحوم بسلسلہ تدریس بارہ بنکی میں مقیم تھے، مگر گاؤں و برادری کے حالات سے غافل نہ تھے۔ جس خاندان سے مولانا کا تعلق تھا۔ اس خاندان کے افراد فتحپور اور اس کے اطراف کی آبادیوں، بالخصوص کاری ساتھ، حمید پور، ندوہ سرائے، گھوسی، وغیرہ میں آباد تھے، گو کہ ان علاقوں میں تعلیم یافتہ اور دیندار حضرات بھی تھے، مگر جہالت اور جاہلی رسوم وعادات کا بھی خاصا غلبہ تھا۔ مولانا کو وعظ وارشاد اور دعوتؔ تبلیغ کا جذبہ تو ابتداء عمر ہی سے مدرسہ اشرف العلوم کانپور کی طالب العلمی کے ہی دور میں پیدا ہو گیا تھا۔ اور اساتذہ کی نگرانی میں کام کا سلیقہ بھی سیکھ لیا تھا، فراغت کے بعد گاؤں اور اطراف کے احوال پر نظر ڈالی، تو معاشرہ میں جو خرابیاں موجود تھیں۔ انھیں دور کرنے کی تڑپ دل میں پیدا ہوئی۔

حافظ محمد زکریا صاحبؒ مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ:

> "آپ نے اپنے ہم عمر فارغ شدہ چند ہستیوں کو لے کر جن میں مولوی عبدالحکیم صاحب، مولوی ظہیر الدین صاحب وغیرہم پیش پیش تھے ایک اصلاحی انجمن قائم کی، جس کا مقصد روزہ، نماز کی تاکید، عورتوں کو پردہ کی تاکید، دینی باتوں کا خیال تھا، محلہ میں جگہ جگہ اجتماع ہوتا، جس میں وعظ ہوتا، اور

عہ ان میں سے بعض مرحوم بھی ہو چکے ہیں اور بہت سارے حفاظ تادم تحریر موجود ہیں جو الحمدللہ اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔

اصلاحی کاموں کا جائزہ لیا جاتا، ترقی کی صورتیں اختیار کی جاتیں، رفتہ رفتہ یہ انجمن اس قدر مقبول ہوئی کہ گاؤں سے نکل کر دوسرے مواضعات میں بھی یہ سلسلۂ خیر شروع ہو گیا اسلامی رشتہ اخوت اور برادری کا خونی رشتہ کارفرما ہو کر پوری برادری میں یہ انجمن قائم ہوئی۔ اور کئی سال تک قائم رہی، جگہ جگہ سالانہ جلسے ہوئے، ندوہ سرائے، حمید پور بنیسواڑہ، خالص پور کے سالانہ جلسے اس انجمن کی یادگار ہیں۔

شادیوں میں جو "گھر پھونک تماشہ دیکھ" کا منظر ہوتا ہے اس انجمن میں اس سے بچنے کیلئے ایک لائحۂ عمل بنایا گیا۔ وہ یہ کہ مہر کا متعین کیا گیا۔ باراتی مقرر ہوئے، دلہن کا کپڑا اور زیور مقرر ہوا، چنانچہ اس وقت جملہ شادیاں اس لائحۂ عمل کے مطابق ہوئیں۔ راقم الحروف اور بھائی محمد فاروق کی شادی اسی دستور کے مطابق ہوئی۔

اسی زمانہ میں حافظ عبدالعلیم صاحب (برادر بزرگ حضرت مصلح الامتؒ) نے چند اشعار انجمن کے جلسوں میں پڑھنے کیلئے بھیجے تھے، حافظ فریدالدین صاحب خاص طور پر وہ اشعار پڑھتے تھے۔ ناظرین کے ملاحظہ کیلئے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

الٰہی عزت ہمیں عطا کر، ہو دور نکبت برادری سے
الٰہی وہ دل ہمیں عطا کر، ڈریں نہ تیرے سوا کسی سے

ادھر یہ حالت ہے مومنوں کی کہ بھائی بھائی سے لڑ رہا ہے

ادھر یہ حالت ہے مشرکوں کی چمار ملتا ہے چھتری سے
الٰہی ہم سب کو ایک کر دے، دلوں سے نفرت کو دور کر دے
دعا یہ سن لے آثر کی یارب جو کر رہا ہے وہ بمبئی سے

عرصہ تک یہ انجمن کامیابی کے ساتھ چلتی رہی۔ مگر بعض لوگوں کی شرارتوں کی وجہ سے اس کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

سلوک:

مولانا نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی، اور جہاں علم کی تحصیل کی تھی، وہاں تصوف و سلوک کا چرچا زوروں پر تھا۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی دکان معرفت کھلی ہوئی تھی تھانہ بھون کا میخانہ محبت عروج پر تھا، تعلیم سے فارغ ہو کر حضرت مصلح الامت بھی وہیں کے ہو کر رہے تھے، مولانا کی دستار بندی حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی تھی، غیر ممکن تھا کہ آدمی کی استعداد قلبی میں سلامتی ہو، دل میں جذبۂ طلب ہو، اور ماحول ایسا عنبر بار ہو، جس میں ہر طرف بوئے محبت و معرفت پھیلی ہوئی ہو۔ ناممکن تھا کہ ایسا آدمی ایسی فضا میں سانس لے، اور اس کا دل و جگر اس کیف و سرور سے مست و سرشار نہ ہو، اور غافل پڑا رہے۔

درس و تدریس کا سلسلہ رہا۔ مگر دل تشنگیٔ محبت سے بیتاب رہا، اپنے قریب ترین رفیق بزرگ کی آمد و رفت تھانہ بھون میں تھی، بلکہ انھیں وہاں ایک درجۂ اختصاص حاصل تھا۔ حضرت کے ساتھ مولانا بھی تھانہ بھون حاضر ہوئے اور وہاں قیام فرمایا۔ حضرت سے بیعت بھی ہوئے۔ اس دور میں حضرت تھانوی بیعت تو کر لیتے تھے، مگر تعلیم و تربیت کے لئے اپنے کسی معتمد خلیفہ کے سپرد فرما دیتے، مولانا کو حضرت اقدس مصلح الامت سے خاص انس اور تعلق تھا، یہ چاہتے تھے کہ

اصلاحی تعلق حضرت مصلح الامت ہی سے رہے، انھوں نے والاحضرت مصلح الامت سے ہی اپنی اس خواہش کا اظہار کیا، حضرت اقدس چاہتے تھے کہ اس کی اجازت حضرت اقدس تھانوی کی طرف سے بھی ہو جائے، تاکہ اس تعلق میں خاص برکت رہے۔ مولانا کی درخواست کے جواب میں حضرت مصلح الامت کا جو جواب موصول ہوا۔ اس سے مضمون خط کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

تحریر فرماتے ہیں:

عزیز از جان سلمہ!   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

یہ لکھ دیجئے کہ وصی (مولانا شاہ وصی اللہ صاحب) میرے عزیز ہیں اور ان سے مناسبت ہے، اور اکثر ان سے ملنے کا اتفاق پڑتا ہے۔ اور حضرت کے یہاں بوجہ مشغولیتوں اور خانگی ضرورتوں کے اور نیز قرض کی وجہ سے حاضر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے درخواست کرتا ہوں کہ اگر میری تعلیم ان سے مضر اور نامناسب نہ ہو، تو میری تعلیم وصی سے متعلق کر دی جائے اور حضور والا کے یہاں دعا اور خیریت دریافت کرنے لئے کبھی کبھی خط لکھتا رہوں گا۔

والسلام

وصی عفی عنہ از تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ
۳۰؍ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ء

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مولانا کی حاضری تھانہ بھون میں دوران تدریس بارہ بنکی ہوئی تھی پھر حضرت اقدس تھانوی کی خدمت میں اجازت طلبی کا خط گیا۔ اور حضرت نے باقاعدہ اجازت دے دی۔ اس کے بعد اصلاحی خطوط کا سلسلہ حضرت مصلح الامت سے شروع ہو گیا۔ مولانا ہر ہر مرحلہ میں

حضرت مصلح الامت سے مشورہ لیتے، اور حضرت بھی نہایت اہتمام سے تربیت فرماتے، بعد میں جب دونوں بزرگ فتحپور میں مستقلاً مقیم ہو گئے تو مکاتبت کے ساتھ براہ راست مخاطبت سے تربیت کا سلسلہ چلتا رہا۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے مولانا نے حضرت اقدس مصلح الامت کی خدمت میں جو عریضے بھیجے تھے ان کے جو جواب حضرت کی طرف سے موصول ہوئے ہیں۔ انھیں درج کر دیا جائے، ایسے خطوط کی تعداد تو بہت ہو گی، مگر ذوق گمنامی کے ہاتھوں نے یہاں بھی اپنا کام کر دکھایا ہے، زندگی کے جہاں اور بہت سے اوراق گمشدہ ہیں، وہیں یہ صفحات بھی زیادہ تر مفقود ہو چکے ہیں۔ حضرت مصلح الامت کے چند نامہائے مبارک خوش قسمتی سے محفوظ رہ گئے ہیں۔ انھیں یہاں درج کیا جاتا ہے۔

ایک خط کے جواب میں حضرت مصلح الامت تحریر فرماتے ہیں:

عزیزم سلمہٗ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

خط آیا۔ حالات مندرجہ سے آگاہی ہوئی، طاعت وکیفیتِ شوق کے ازدیاد سے بہت خوشی ہوئی، جس کے مناسب یہ شعر لکھنے کو جی چاہتا ہے ؎

گلشن ایجاد میں پھولوں پھلوں ہو مرا نخلِ تمنا بارور
اس چمن کے غنچہ و گل میں مجھے جلوۂ رنگیں ترا آئے نظر
دیکھ لوں ذرات میں اک آفتاب جب اٹھاؤں دیدۂ وحدت نگر
درد تیرا منت کش درماں نہ ہو درد ہی تیرا ہو میرا چارہ گر
ذرہ تیرا دل مرا ہو اس طرح رنگ گل ہو جس طرح اور آب گہر
شوق میں تیرے جیوں تا زندگی عشق میں تیرے گزاروں عمر بھر

وقت جو گزرے وہ تیری یاد میں   جان جب نکلے تو تیرے نام پر
گور کی منزل جوار قرب ہو   جب کروں اس دارِ فانی سے سفر

وَالسَّلام عَلی العَاشق التہام
وصی اللہ عفی عنہ

حضرت کے اس مکتوب مبارک سے مولانا کے ذوق باطنی کا پتہ چلتا ہے، عبادت میں حلاوت ولذت کی کیفیت محسوس ہونے لگی تھی، حضرت نے جو اشعار مولانا کے کیف باطنی سے متاثر ہو کر تحریر فرماتے ہیں۔ ان کے آئینہ میں مولانا کا جمال باطن اور حسن اندروں جھلکتا ہے۔ اور اخیر میں حضرت نے انھیں "عاشق حیراں" کا لقب دیکر ان کے باطن میں مستعد عشق الٰہی کی کھلی شہادت پیش کر دی ہے۔ مرشد کی طرف سے ایسا اظہار و اعلان، مرید کے حق میں نہایت بیش قیمت تاثر ہے۔

کسی مکتوب میں مولانا نے شکایت تحریر کی کہ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں دل جس تعلق ونسبت اور کیفیت کا آرزومند ہے۔ اس سے محرومی ومہجوری معلوم ہوتی ہے باطن جیسے پہلے تہی مایہ تھا، اب بھی تہی دامن محسوس ہوتا ہے۔ اس کے جواب میں حضرت نے تحریر فرمایا:

عزیزی سلمہٗ   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

میں بفضلہ تعالیٰ بخیریت ہوں، مولانا عبد القدوس قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو ہزار سال مجاہدہ کے بعد "درد نایافت" مل جائے تو اس نے سب کچھ پالیا، ذرا خیال تو فرمائیے۔ ؎

سرِ دِ غم عشق بوالہوس را ندھند   سوزِ دل پروانہ مگس را نہ دہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار   سرمدایں دولت ہمہ کس را نہ دہند[1]

---

[1] سرد "غم عشق" بوالہوس کو نہیں دیتے، پروانہ کا سوز دل، مکھی کو نہیں عطا فرماتے، ایک عمر درکار ہے کہ دوست پہلو میں آئے یہ دولت ہر شخص کو نہیں دیا کرتے۔

مولانا فرماتے ہیں:

اندریں رہ می تراش و می خراش!　　تا دمِ آخر دمے فارغ مباش
تا دمِ آخر دمِ آخر بود　　کہ عنایت با تو صاحب سر بود[1]

ان مضامین میں غور کر کے اپنے کام میں لگے رہیے، انشاء اللہ ایک دن نوید وصل سنئے گا۔

والسلام

وصی اللہ عفی عنہ

حضرت کے اس جوابی مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کے قلب میں وصال مقصود کی کیسی بے چینی تھی اور جب انھیں اس میں تاخیر محسوس ہوئی، تو اپنے ہادی و رہنما سے عرض حال کی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے قرب کی راہ میں عاشقوں کو ان گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے، حق تعالیٰ کی ذات بے نیاز بھی ہے اور محبوب بھی ہے، بندوں کے دلوں میں اس نے اپنی محبت بھی رکھی ہے، اور اس کے لوازم میں سے نیازمندی بھی رکھدی ہے۔ بندہ اپنی عبدیت پیش کر کے آرزومند ہوتا ہے کہ اس کے صلے میں اسے قرب و وصال کی لذت و حلاوت محسوس ہونے لگے، اور اسے گونہ اطمینان ہو جائے کہ حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی سے وہ سرفراز ہو رہا ہے۔ ادھر اس کا عشق یہ چاہتا ہے، اور دوسری طرف حق تعالیٰ کی بے نیازی اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ وہاں کا تو سارا مدار ایمان بالغیب پر ہے، سالک کو کچھ محسوس ہی نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات اس سے ایسی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں کہ

---

[1] اس راہ میں برابر تراش و خراش میں لگے رہو۔ آخر دم تک ایک لحہ کیلئے فارغ نہ بیٹھو، ہو سکتا ہے کہ جب آخری دم ہو تو حق تعالیٰ کی عنایت کا نزول ہو جائے۔

وہ اپنے کو بالکل محروم و درماندہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اس وقت بندہ کی بے بسی قابل دید ہوتی ہے۔ سالک حیران و پریشان ہوتا ہے، کبھی کبھی اس کی آس ٹوٹنے لگتی ہے، یہی وقت ہوتا ہے جب مرشد کامل اس کا ہاتھ پکڑتا ہے، اور اسے بتاتا ہے کہ یہی احساس عجز و درماندگی، اور یہی دو دنایافت تو بندے کی اصل دولت ہے، جو اس دنیا میں اسے عطا کی جاتی ہے، یہاں خالی ہونے کا احساس، آخرت میں اس کے ظرف کو پر کریگا ہے، عارفین کی منتہائے پرواز یہی ہے کہ بالآخر عجز و نارسائی کا وہ اعتراف کرتے ہیں۔ ماعرفناك حق معرفتك۔

یہ بات اگر کسی بندے کو واقعی حاصل ہو گئی، تو اسے دولت لازوال حاصل ہو گئی، اس کی قدر عارفین ہی جانتے ہیں۔

دور بینان بارگاہ الست
غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

حق تعالیٰ کی بارگاہ میں دور تک نگاہ رکھنے والے بھی بجز اس کے اور کچھ نہیں رکھتے کہ وہ موجود ہے۔

واقعی ایمان بالغیب کا حقیقی لطف بھی اسی میں ہے کہ جو غیب ہے، وہ بہمہ وجوہ غیب رہے، بندہ اس کے لئے تڑپ تڑپ کر رہے، مگر غیب کا پردہ اور گہرا ہوتا جائے۔ جو حلاوت اس ظاہری دوری و مہجوری میں ہے، اس کی لذت عشاق ہی جانتے ہیں۔ پھر جب یہ دنیا تبدیل کر دی جائے گی۔ تو غیب کا رنگ بھی بدل جائے گا۔ اس وقت کچھ اور ہی کیفیات حاصل ہونگی ؎

لذت ایں بادہ نشناسی بخدا تا نہ چشی

تجلّیٔ بے کیف

ایمان بالغیب ایک بے کیف تجلی ہے، جس سے سالکین اپنے سلوک کی انتہا میں نوازے جاتے ہیں۔

لیکن اس کی جھلکیاں پہلے سے دکھائی دینے لگتی ہیں۔ مولانا کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس سے نوازا تھا۔ کسی خط میں اس طرح کے کسی معاملہ کا ذکر کیا۔ تو حضرت نے تحریر فرمایا:

مولانا سلّمہٗ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

مجموعی حالات قابل شکر ہیں، اللہ تعالیٰ مزید فرمائے، خواب ماشاء اللہ نہایت مبارک ہے۔ یہ تجلّی بے کیف تھی مبارک ہزار بار مبارک۔ ؎

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست

دل سے دعا کرتا ہوں۔ والسلام

وصی اللہ عفی عنہ

سالک لحظہ بلحظہ ترقی کر رہا ہے۔ آدمی آس توڑ کر نہ بیٹھے، کام کرنے پر جما رہے، تو اللہ تعالیٰ کی رحمت نوازنا جانتی ہے۔ شریعت و طریقت کا آخری مرتبہ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس کی تشریح آپ نے یہ فرمائی ہے کہ ان تعبد اللہ کانک تراہ۔ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو، جیسے تم خدا کو دیکھ رہے ہو۔ بندہ اپنے پروردگار کو دیکھ رہا ہو، تو اس کے آداب بندگی کا انداز ہی اور ہوگا۔ یہی انداز بندگی پیدا ہو جائے تو احسان کا مرتبہ حاصل ہو گیا اب یہ سالک کا کام ہے کہ اس میں رسوخ اور گہرائی پیدا کرتا چلا جائے۔ حضرت ایک خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

مولانا سلّمہٗ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

آپ کے حالات سے نہایت مسرت ہوئی ہے، اور دل سے دعا نکلتی ہے، نماز میں یہ کیفیت احسان کہلاتی ہے،

مبارک! ہزار بار مبارک۔ میرے لئے بھی دعاء فرماتے رہیئے۔

والسلام

وصی اللہ عفی عنہ۔ کوپاگنج۔

مکاتیب کے گمشدہ اوراق میں یہ چند صفحات تلاش کرنے والوں کو مل گئے، ان سے مولانا کی کیفیات باطنی کا ایک ہلکا سا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ حضرت اقدس کے نام مولانا کا ایک مکمل مکتوب بھی مل گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ حضرت کا جواب بھی ہے۔ مضمون خط پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی دور کا خط ہے۔ خط کا متن ملاحظہ ہو۔

جناب حضرت مولانا ومقتدانا ومرشدنا دامت برکاتہم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

خط سابق جو روانہ کیا تھا، ارسال خدمت ہے، اب نہایت اہتمام واختیار سے کام لیتا ہوں۔ بحمد اللہ آپ کی دعاؤں کی برکت سے نہایت ہی منفع ہے، دعا کا خواستگار ہوں، اللہ تعالیٰ اس پر استقامت عطا فرمائے۔

اور وہی بارہ ہزار اسم ذات اور دوازدہ تسبیح پڑھتا ہوں۔ خاص کوئی بات قابل ذکر نہیں۔ ہاں البتہ یہ بات طبیعت کے اندر بحمد اللہ نہایت راسخ ہوگئی ہے (اور یہ حضور کی برکت ہے) کہ زندگی بھر اگرچہ کوئی کیفیت وثمرہ نہ حاصل ہو۔ لیکن ذکر نہ چھوڑوں گا۔ اب اس کا اثر یہ ہے کہ اکثر قبض کی سی حالت رہتی ہے۔ لیکن معمولات بحمد اللہ نہایت اہتمام سے پورا کرتا ہوں اب معمولات کے متعلق حضور جو ارشاد فرمائیں۔ اسی پر کاربند رہوں۔

اور ایک بات قابل عرض ہے کہ نماز میں یکسوئی کا مراقبہ جو بتلایا گیا ہے کہ قرآن شریف کے ایک ایک لفظ کو بقصد پڑھیں تو ان تعبد اللہ کانک تراہ۔ پر اگر کوئی شخص عمل کرنا چاہے تو بظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے، کیونکہ نفس ایک وقت میں دو طرف کیسے متوجہ ہو سکتا ہے اور ان تعبد اللہ پر اگر عمل کریں تو قرآن شریف جس کے پڑھنے کا حکم تدبر معانی کرکے ہے، وہ حاصل نہیں ہوتا، حضور والا مجھ کو اس ورطے نکال کر تسلی بخش، کیونکہ کئی دن سے اس کھٹکا شیطان وسوسہ دلا رہا ہے۔ فقط والسلام۔

جواب حضرت مصلح الامت:۔

کیا ان تعبد اللہ کے یہ معنی ہیں کہ رویت حق کا تصور کیا جائے اور یہ کس عبارت کا مدلول ہے، اس میں تصور کا لفظ کیا ہے۔

اس خط میں کئی باتیں محتاج تشریح ہیں، جو لوگ تصوف وسلوک کی بنیادی اصطلاحوں سے واقف ہیں۔ انھیں تو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن کتاب کے عام ناظرین میں غالباً ان سے واقف کم ہی ہوں گے۔ اور اب تو دنیا داری اور کسب معاش کے اہتمام نے احسان وسلوک کو "سبزۂ بیگانہ" بنا کر رکھ دیا ہے۔ پھر مزید یہ کہ ہم مسلمانوں کے درمیان سے اردو زبان ہی کا رواج آہستہ آہستہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ بکثرت ہندی الفاظ نے اردو کی جگہ لے لی ہے۔ خالص فارسی کے علاوہ الفاظ جو کبھی اردو میں رائج اور بالکل عام فہم تھے۔ انھیں اب سمجھنے والے بہت کم رہ گئے ہیں۔ اس خط میں کئی ایسے الفاظ آئے ہیں، جنھیں ان کے اصل

مفہوم میں سمجھنا لوگوں کے لئے مشکل ہوگا، سب سے پہلے تو بارہ ہزار اسم ذات کا لفظ دشوار نظر آئے گا۔ اسم ذات، کلمہ "اللہ" ہے، یہ ذات حق تعالیٰ شانہ کا اصل نام ہے اور باقی جو نام اللہ تعالیٰ کے ہیں، وہ اللہ کی کسی نہ کسی صفت کو بتاتے ہیں۔ اور یہ کلمہ ذات کو بتاتا ہے۔ حضرات مشائخ دل میں اللہ کی بے نہایت محبت اور اس کا استحضار پیدا کرانے کیلئے صرف اسی کلمہ کا ورد ۱۲ر ہزار ۲۴ر ہزار سے لیکر لاکھ سے زائد تک تجویز کرتے ہیں۔ تجربہ سے اس کی خاص تاثیرات معلوم ہوئی ہیں۔

دوسرا لفظ "دوازدہ تسبیح" ہے، دوازدہ کے معنی بارہ کے ہیں۔ اردو میں اس کا مطلب ہوتا "بارہ تسبیح" یہ حضرات مشائخ چشتیہ صابریہ کے یہاں ذکر الٰہی کی بنیادی مشق ہے، جو ابتدار سلوک سے شروع ہوتی ہے، اور تکمیل کے بعد بھی اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہ ایک مشق ہے، جس سے دل میں اللہ کی یاد کا رسوخ ہوتا ہے، غیر اللہ کی محبت قلب سے خارج ہوتی ہے، اصلاح اخلاق کی اس سے استعداد پیدا ہوتی ہے، نیز اللہ کے سوا دوسرے تعلقات سے آدمی کو نجات ملتی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

باوضو قبلہ رو، دو زانو یا چار زانو بیٹھ کر آدمی اللہ کی طرف متوجہ ہو کر چند بار درود شریف پڑھتا ہے، اللہ کے غیر سے دل کی طہارت، اور معرفت کے نور سے اس کے روشن ہونے کی دعا کرتا ہے، پھر قدرے آواز کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کا ذکر شروع کرتا ہے، طریقہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ دل جو بائیں پستان کے نیچے ہے لا الٰہ کہتے ہوئے اپنے سر کو وہاں سے دائیں جانب پشت کی جانب متوجہ کرتے ہوئے یہ تصور کرتا ہے کہ اللہ کے سوا ہر ایک کی محبت دل سے نکال کر پیچھے ڈال دی، اور پھر وہاں سے سر کو لا کر دل پر الا اللہ کہتے ہوئے ایک ہلکے جھٹکے کے ساتھ ضرب

لگاتا ہے، اور یہ خیال کرتا ہے کہ اس میں خدا کی محبت جاگزیں کر دی۔

اسی طرح دو سو مرتبہ کہے، اور ہر آٹھ نو مرتبہ کے بعد ایک بار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پڑھے۔ یہ دو تسبیح ہوئی، پھر چار سو مرتبہ لفظ الا اللہ کی ضرب دل پر لگائے اور یہ خیال کرے کہ دل میں صرف اللہ کی محبت ہے، یہ چھ تسبیح ہوئی، اس میں بھی تھوڑے تھوڑے وقفہ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتا رہے۔

اس کے بعد چھ سو مرتبہ "اللہ اللہ" کی ہلکی ضرب دل پر لگائے، یہ کل بارہ تسبیح ہوئی۔ آخر میں ایک سو مرتبہ کلمہ "اللہ" کہہ لے۔ کل تسبیحیں اس طرح تیرہ ہوتی ہیں لیکن مشائخ کے عرف میں اسے بارہ تسبیح ہی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، واضح ہو کہ ذکر کا یہ طریقہ عمل خود سے نہیں اختیار کیا جا سکتا ہے۔ جب کوئی شیخ تلقین کرے اور اس کا طریقہ بتائے، جبھی اس پر عمل درآمد کرنا چاہیے۔

صوفیہ کے اصطلاح میں "قبض" بھی ایک خاص لفظ ہے۔ سالک جب اللہ کے قرب ورضا کی راہ طے کرتا ہے، تو کبھی اس پر ذوق وشوق کی کیفیت طاری ہوتی ہے، عبادت میں خوب جی لگتا ہے، تلاوت اور ذکر میں حلاوت محسوس ہوتی ہے، طبیعت پر نشاط طاری رہتا ہے، یہ حالت بسط کہلاتی ہے، اور کبھی اس کے برعکس طبیعت بجھی بجھی رہتی ہے۔ کسی عبادت میں جی نہیں لگتا، ذکر و تلاوت سے طبیعت گھبراتی ہے، دل تنگ رہتا ہے۔ یہ حالت قبض کہلاتی ہے اس حالت میں ذکر وعبادت اور تلاوت ومناجات پر استقامت زبردست مجاہدہ ہے۔

مولانا کا اشکال:

اپنے اس خط میں مولانا نے ایک اشکال کیا ہے۔ اور یہ اشکال عموماً

اہلِ علم کو پیش آتا ہے۔ اس لئے اس کی قدرے تشریح کر دینی مناسب ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے نماز میں جی لگانے، استحضار پیدا کرنے اور وساوس کے دور کرنے کا ایک سہل اور قابل عمل نسخہ تجویز کیا ہے، نماز پڑھنے والا ذرا دھیان اور اہتمام سے اس کو روبعمل لاتا رہے، تو امید ہے کہ تھوڑی مدت میں اسے وساوس وخطرات کی شکایت باقی نہیں رہے گی۔ وہ نسخہ یہ ہے کہ آدمی نماز میں جو کچھ پڑھتا ہے، اسے سوچ سوچ کر پڑھے یعنی ہر لفظ پر یہ خیال رکھے کہ میں اب یہ لفظ زبان سے ادا کر رہا ہوں۔ گویا اپنے خیال کو نماز میں پڑھے جانے والے کلمات وحروف پر مرکوز کر دے۔ شروع میں کچھ دقت ہوگی۔ لیکن پھر آسان ہو جائے گا۔ کوئی لفظ یاد سے بے خیالی میں نہ پڑھے، جیسے کوئی کچا حافظ ہوتا ہے تو تراویح میں ایک ایک لفظ سوچ کر پڑھتا ہے۔ پھر اگر نماز پڑھنے والا عالم ہے، جو الفاظ کے معنی سمجھتا ہے، تو اسے معانی کا بھی تدبر کرتے رہنا چاہیئے۔ ایک بات تو یہ ہوئی۔

دوسری بات یہ ہے کہ حدیث میں احسان کی تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے کہ ان تعبد اللہ کانك تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراك، اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے۔ تو وہ تو تمھیں دیکھ رہا ہے۔ اس حدیث کی تشریح بہت سے حضرات یہ سمجھتے ہیں اور کہتے بھی ہیں کہ نماز میں اور دوسری عبادات میں یہ تصور ہونا چاہیئے کہ نماز پڑھنے والا اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ اور اگر یہ نہ ہو سکے تو یہی تصور کرے کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔

اس مطلب کی بنیاد پر مذکورہ بالا دونوں باتوں میں تعارض اور تضاد معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اگر حروف وکلمات کا تصور کرے گا، اور انھیں سوچے گا

تو یہ تصور نہیں ہوسکتا ہے کہ وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے، یا اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اور اگر اللہ کے دیکھنے کا تصور کرتا ہے، تو پھر حروف و کلمات کا خیال باقی نہیں رہے گا، اس تعارض کی بنا پر مولانا درطۂ حیرت میں تھے،

حضرت نے اس کا جواب مختصر سا دیا، مگر اسی سے راہ روشن ہوگئی۔ مولانا جیسے ذہین و فطین کے لئے اتنا اشارہ کافی تھا۔ حضرت نے فرمایا کہ "کیا ان تَعبُد اللہ کے یہ معنی ہیں کہ رویت حق کا تصور کیا جائے۔ اور یہ کس عبارت کا مدلول ہے، اس میں تصور کا لفظ کیا ہے"۔ مطلب یہ ہے کہ حدیث میں اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کے تصور کا تو ذکر کوئی نہیں ہے، نہ اس کے لئے اس حدیث میں کوئی لفظ موجود ہے۔ پھر یہ مطلب کیسے مراد لے لیا گیا کہ اللہ کو دیکھنے کا تصور کرے۔

بات یہ ہے کہ اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے یا اپنے دیکھے جانے کے تصور کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ بلکہ بتانا یہ ہے کہ اگر کوئی آقا اپنے غلام کو یہ حکم دے کہ فلاں کام کرو، اور پھر وہ سامنے رہ کر اس کی نگرانی بھی کرنے لگے، وہ غلام بھی دیکھ رہا ہے کہ میرا آقا مجھے کام کرتا ہوا دیکھ رہا ہے، تو خیال کیجئے وہ غلام کتنے انہماک اور شوق سے اس کام کو انجام دے گا۔ اور اس کی انجام دہی میں کس قدر حسن و خوبی پیدا کرے گا۔ اس کے برخلاف اگر مالک حکم دے کر چلا گیا۔ اور نگرانی نہیں کر رہا ہے، تو اسی غلام کے کام کرنے کا انداز بدل جائے گا حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب تم عبادت کرو تو تمہارے عمل کی کیفیت اور قلبی حالت وہی ہونی چاہئیے۔ جیسے مالک سامنے موجود ہو، اور تم اسے دیکھ رہے ہو بتاؤ اس وقت تمہارے عمل کی حالت کیا ہوتی؟ وہی حالت رہنی چاہئیے۔ اس پر اگر کسی کو اشکال ہو کہ خدا کو ہم دیکھ رہے ہوں، یہ تو ممکن ہی نہیں۔ پھر وہ کیفیت کہاں سے لائی جائے، تو اس کا جواب دوسرے جملے میں ارشاد فرمایا گیا کہ

عمل کی یہ کیفیت اور عبادت کی یہ حالت تمہارے دیکھنے پر موقوف نہیں ہے یہ تو مالک کے دیکھنے پر موقوف ہے، غلام اگر یہ جانتا ہے کہ میرا مالک مجھے دیکھ رہا ہے، چاہے غلام خود نہ دیکھ رہا ہو، جب بھی عمل کا وہی انہماک باقی رہے گا تو بہر حال اللہ کی نگرانی تو قائم ہی ہے۔ اس لئے تمہاری عبادت کیسی ہونی چاہئے خود اپنے دل سے پوچھ کر دیکھ لو اس نکتہ کو سمجھ لینے کے بعد اشکال ختم ہو جاتا ہے، وساوس کو دور کرنے کے لئے جو نسخہ تجویز کیا گیا ہے، وہ فکر و خیال کو پابند کرنے کی مشق ہے، اور حدیث میں جو بات ارشاد فرمائی گئی ہے، وہ حسن عبادت کی تعبیر و تشریح ہے، یعنی عبادت اور کام میں ایسی خوبی، انہماک، یکسوئی اور ذوق و شوق ہونا چاہئے، جیسا مالک کے سامنے ہوتے ہوئے ہو سکتا ہے۔ ان دونوں باتوں میں کوئی متعارض نہیں، متعارض تو کیا اول الذکر نسخۂ عمل اس مقصد عظیم یعنی احسان کے حصول کا ذریعہ اور مددگار بنے گا۔

اجازت بیعت

مولانا اپنی غیر معمولی استقامت اور پابندئ اوراد و اذکار کے باعث ہر روز باطنی مدارج میں ترقی کرتے رہے، حضرت تھانویؒ کے خاص خاص متوسلین و خلفاء کا دستور تھا کہ وہ اپنے زیر تربیت ہونہار سالکین کے حالات و مکاتیب وقتاً فوقتاً حضرت اقدس تھانویؒ کی خدمت میں پیش کرتے رہتے تھے، پھر حضرت ان کے حالات کو ملاحظہ فرما کر مشورے دیتے، مولانا کے حالات کو دیکھ کر حضرت نے انھیں مجاز صحبت بنایا تھا، حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے یہاں صاحب اجازت حضرات کی دو قسمیں تھیں، بعض حضرات کی صلاحیت و استعداد اور نسبت کا رسوخ دیکھ کر حضرت انھیں بیعت و تربیت کی اجازت

دے دیتے تھے، اور بعض لوگوں میں اجازت بیعت کی صلاحیت تو پیدا ہو جاتی تھی، لیکن حضرت کو ان کی کسی خاص حالت کا انتظار ہوتا تھا، ایسے لوگوں کو مجاز صحبت بنا دیتے تھے، یعنی یہ کہ لوگ ان کی خدمت میں بیٹھیں، ان کے ملفوظات و مواعظ سنیں اور بس! انھیں بیعت کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب مدظلہ مفتی اعظم دار العلوم دیوبند نے حضرت حافظ محمد طٰہٰ صاحب کوٹریاپاری اور حضرت مولانا عبد المجید صاحب کوٹھیادی علیہما الرحمۃ سے نقل کیا ہے کہ حضرت مولانا عبد القیوم صاحب کو حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ نے مجاز صحبت بنایا تھا۔

حضرت مفتی صاحب مدظلہ کے خط کی نقل ملاحظہ ہو۔

باسمہ سبحانہ

عزیز محترم! زاد اللہ مکارمکم ومعالیکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

احقر کو خوب یاد ہے، اور بہت صحیح یاد ہے کہ جناب کے والد محترم حضرت مولانا عبد القیوم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مجھے مولانا سید عبد المجید صاحب کوٹھیادی اور جناب حافظ محمد طٰہٰ صاحب کوٹریاپاری سے معلوم ہوا تھا کہ جناب کے والد موصوف رحمہ اللہ، حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مجاز صحبت تھے، اور یوں بھی دیرینہ تعلقات کی وجہ سے سمجھا تھا کہ موصوف بڑے خلیق اور ملنسار تھے۔

فقط والسلام

العبد، نظام الدین ۱۳/۵/۱۴۱۶ھ

حضرت مصلح الامت علیہ الرحمۃ کی وفات کے بعد جب ان کے خلفاء کی فہرست شائع ہوئی تو اس وقت ایک خاص واقعہ سے متأثر ہوکر، مولانا نے ظاہر فرمایا کہ حضرت نے مجھے بھی اجازت دی تھی، چنانچہ جس خط میں اجازت تھی، اسے انھوں نے اپنے صاحبزادۂ گرامی قدر مولانا قاری ولی اللہ صاحب مدظلہٗ کو دکھایا بھی۔ مگر ان پر خمول و گمنامی کا وہ جذبہ طاری تھا کہ اس کے بعد نہ کبھی اس کا ذکر آیا، اور نہ انھوں نے اس خط کی حفاظت کا کوئی اہتمام کیا۔ اور اب وہ بھی پردۂ خفا میں ہے۔

حضرت اقدس مصلح الامت کی بارگاہ میں قرب و اختصاص!

گزشتہ سطور میں یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ مرید رشید اور مرشد کامل دونوں ہم وطن تھے، عمر کا بھی بہت زیادہ تفاوت نہ تھا، ابتدائی تعلیم دونوں نے ایک ہی استاذ سے پائی۔ ان مناسبتوں کی وجہ سے جو قرب اور تعلق تھا وہ تو ظاہر ہی ہے۔ وطن میں مستقل اقامت کے بعد مزید قرب یوں بڑھا کہ حضرت اقدس نے اپنے آبائی مکان و جائداد کی وراثت میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ حضرت نے مولانا سے فرمایا کہ میں آپ کے قریب ہی رہنا چاہتا ہوں، اسی خیال کے پیش نظر مولانا کے مکان کے قریب تھوڑی سی زمین حضرت کے بڑے بھائی کی تھی، حضرت نے اسے ان سے لے لیا۔ اور کچھ زمین مولانا عبد القیوم صاحب کے کسی عزیز کی تھی حضرت نے مولانا عبد القیوم صاحب کے واسطے سے اسے بھی لیکر اس کا معاوضہ ادا کر دیا۔ پھر اسی زمین پر حضرت نے اپنا رہائشی مکان تعمیر کرایا۔ یہ نیا مکان

مولانا عبدالقیوم صاحب کے مکان سے بالکل متصل تھا۔

اب دن رات کا قرب نصیب ہوگیا۔ اس وقت حضرت کی شہرت عام نہیں ہوئی تھی۔ اوقات زیادہ تر فارغ رہتے، کم لوگوں کی آمدورفت تھی۔ اس وقت مولانا کو حضرت کی صحبت خوب نصیب ہوئی۔ گھنٹوں گھنٹوں صبح کو والد صاحب کے احاطہ میں بیٹھ کر والد صاحب سے باتیں کیا کرتے تھے۔ بعد میں جب حضرت کی شہرت عام ہوئی۔ اور لوگوں کی کثرت سے آمد ہونے لگی۔ اور حضرت کی مشغولیت بڑھی تو اب اتنا ظاہری قرب ظاہر ہے کہ باقی نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن اپنے اعمال و اوراد میں ہمیشہ نشیط و مستعد رہتے، مدرسہ میں پڑھاتے، حضرت کے یہاں آنے والے مہمانوں کی بکثرت خاطر و مدارات کرتے، حضرت اقدس کا ایک خاص انداز اصلاح تھا۔ ابتداء میں اس میں جلال کا رنگ غالب تھا، سالکین کی غلطیوں پر دار و گیر فرماتے، سخت مواخذہ فرماتے۔ بعض لوگ مجلس سے اٹھا دیئے جاتے، بعض لوگوں کو مجلس میں باریابی کی اجازت نہ ہوتی اس سے بعض طبیعتیں دلگیر ہوتیں۔ ان میں یاس کی کیفیت محسوس ہونے لگتی، تو مولانا مرحوم انکو تسلی دیتے، سلوک و طریقت کے نشیب و فراز سمجھاتے، شیخ کے مواخذے اور دار و گیر کے فوائد بتاتے، اور اس طرح شیخ سے اور قریب کر دیتے۔

استقامت اعمال

حضرت مصلح الامت کے متوسلین میں ایک بات کا عموماً مشاہدہ ہوا ہے کہ یہ حضرات اپنے اعمال و اذکار کے نہایت پابند ہوتے ہیں۔ معذوری اور بیماری کی حالت میں بھی عبادات اور اذکار و اوراد کا اہتمام باقی رہتا ہے، مولانا عبدالقیوم صاحب بھی ان خوش قسمت انسانوں میں تھے، جن کو یہ دولت بحمدہٗ وافر

نصیب ہوئی تھی۔

مولانا تہجد کے نہایت پابند تھے، سفر حضر، صحت و مرض کسی حالت میں تہجد کی نماز فوت نہیں ہوتی ہے۔ حدیث میں اس نماز کو دأب الصّالحین فرمایا گیا ہے، یعنی صالحین کا دستور العمل، یہ انبیاء کی قدیم ترین سنت ہے مولانا کو تہجد کی نماز سے بے حد شغف تھا، صبح صادق سے بہت پہلے بیدار ہوجاتے حافظِ قرآن تھے، طویل طویل رکعتوں سے تہجد ادا کرتے، اس کے بعد دعاء و مناجات میں لگ جاتے۔

فجر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا فرما کر چاشت کے وقت تک مسجد میں معتکف رہتے، قرآن پاک کی تلاوت مناجات مقبول، حصن حصین، دلائل الخیرات کی منزلوں کا ورد کرتے، دعائے حزب البحر پڑھتے۔ قصیدہ بردہ پڑھتے ان چیزوں کا ہمیشہ اہتمام رہا۔ اس کے علاوہ چلتے پھرتے ہاتھ میں تسبیح لئے ذکر اللہ سے رطب اللسان رہتے۔

ان اعمال پر آپ کو استقامت حاصل تھی، نماز باجماعت کا نہایت اہتمام کرتے۔

ذوق دعاء:

اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا وظیفۂ عبدیت ہے۔ بندہ کی بیچارگی جس قدر دعا سے ظاہر ہوتی ہے اتنی اور کسی چیز سے نہیں ہوتی، بندہ اپنی چھوٹی بڑی سب ضرورتیں اللہ کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ پھر وہ مطمئن ہوجاتا ہے۔ اس طرح دعا اظہار بیچارگی کا آئینہ بھی ہے، اور حصول اطمینان کا ذریعہ بھی، مولانا کو دعا کا خاص ذوق تھا۔ ہر ہر امر میں دعاء کا اہتمام فرماتے۔ خود بھی نہایت

تضرع وزاری کے ساتھ دعا مانگتے اور اپنے متعلقین کو بھی دعا کا حکم دیتے، انکی ترغیب دیتے، مولانا قاری ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ ذرا بھی کوئی تکلیف کی بات پیش آتی تو آپ فرماتے کہ بھائی دعا کرو۔

قاری صاحب کے بڑے بھائی قاری اسد اللہ صاحب مرحوم باہر رہتے تھے، ان کا خط آنے میں کبھی تاخیر ہوتی، تو مولانا بے چین ہوتے۔ اس وقت قاری صاحب بچے تھے، مولانا فرماتے کہ ولی اللہ دعا کرو کہ اسد اللہ کا خیریت کا خط آجائے، تو تم کو ایک پیسہ دوں گا۔ عورتوں میں بھی یہ بات مشہور تھی کہ فلاں کا خط نہیں آرہا ہے، اب ولی اللہ کو دعا کے لئے پیسہ ملے گا۔

دعا کے سلسلے میں تلقین فرماتے کہ پہلے استغفار کرو، پھر قرض سے سبک دوشی کی دعا کرو۔ پھر جنت الفردوس مانگو۔ قاری صاحب فرماتے ہیں کہ ان کی تلقین کا یہ اثر ہے کہ ہر نماز کے بعد یہ تینوں دعائیں بغیر ارادہ کے بھی زبان پر آجاتی ہیں حالانکہ حق تعالیٰ کے فضل وکرم سے اب قرض کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

اذکار مسنونہ سے شغف

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم سنتوں میں سے ایک بڑی سنت آپ کی وہ دعائیں ہیں، جنھیں آپ مختلف اوقات میں اللہ کے حضور پیش کیا کرتے تھے، جاننے والے جانتے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا کوئی لمحہ اللہ تعالیٰ کے پاک ذکر اور دعا و مناجات سے خالی نہ گزرتا تھا۔ ہمہ وقت آپ ذکر سے رطب اللسان اور محو دعا و مناجات رہتے تھے صبح وشام کی دعائیں، سوتے وقت اور بیدار ہونے کے وقت کی دعائیں بہت سی آپ سے منقول ہیں۔ اگر کوئی شخص ان دعاؤں کا ان کے اوقات پر اہتمام

رکھے، تو اس کا سارا وقت ذکر و دعا سے معمور ہو جائے گا۔ اور اگر استحضار قلب اور کیفیت احسان کے ساتھ انھیں اپنا ورد بنائے، تو انشاء اللہ اس عظیم سنت کا نور اسے مرتبۂ ولایت تک پہونچا دے گا۔ یہ دعائیں مختصر بھی ہیں اور طویل بھی! لیکن جنھیں اتباعِ سنت کا شوق ہے، ان کے لئے ان کا یاد کر لینا بہت سہل ہے۔ ان دعاؤں میں بندگی کی روح رچی اور بسی ہوئی ہے۔ عبدیت کی تواضع ان کے لفظ لفظ سے آشکارا ہے۔ یہ دعائیں بندہ کو سراپا عجز و نیاز بنا کر اللہ کی پاک بارگاہ میں کھڑا کر دیتی ہیں۔ یہی عبدیت بندہ کے لئے معراج کمال ہے یہاں پستی ہی میں بلندی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر عبدیت کا کمال کسے حاصل ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عبدیت کی شہادت قرآن پاک میں دی۔ سُبحَانَ الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً الخ اور وانہ لما قام عبد اللہ یدعوہ کادوا یکونون علیہ لبدًا۔

آپ کے امتی کا بھی درجۂ کمال یہی ہے کہ اس عبدیت اور فنائیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر رہے اور اس کا آسان ذریعہ یہ ہے کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کو ان کے اوقات و احوال میں استحضار قلب کے ساتھ پڑھتا رہے۔

حضرت مولانا عبد القیوم صاحب علیہ الرحمۃ کو ان اذکارِ مسنونہ اور ادعیۂ ماثورہ کا بہت اہتمام تھا۔ آپ التزام کے ساتھ ان دعاؤں کو پڑھا کرتے تھے دعاؤں کا مجموعہ جو حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے مناجات مقبول کے نام سے ترتیب دیا ہے۔ اس کی ایک منزل روزانہ پڑھنے کا دستور تو تھا ہی، اس کے علاوہ مختلف اوقات کی وارد شدہ دعائیں بھی بڑے اہتمام سے آپ کے معمولات میں شامل رہتی تھیں۔

ان کے فرزند عالی مقام مولانا قاری ولی اللہ صاحب مدظلہ ذکر فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ والد صاحب ادعیہ مسنونہ کا تذکرہ فرما رہے تھے، اور ہم لوگوں کو ان کے پڑھنے اور انھیں اپنا معمول بنانے کی ترغیب دے رہے تھے، اسی دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طویل دعا کا ذکر آیا، جسے آپ تہجد کے وقت پڑھا کرتے تھے، والد صاحب نے وہ دعا پڑھنی شروع کی اور اول سے آخر تک بے تکلف پڑھ دی، ہم لوگوں کو حیرت ہوئی کہ اتنی طویل دعا، اور اس قدر برجستہ یاد! اندازہ ہوا کہ روزانہ اس کے پڑھنے کا اہتمام ہے۔ تتمیم فائدہ کیلئے وہ دعا مع ترجمہ کے یہاں نقل کی جاتی ہے۔ اس ایک دعا ہی سے اندازہ ہو جائے گا، کہ دعا کی روح کیا ہوتی ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وظیفۂ بندگی کس کس طرح ادا کیا ہے، اور یہ کہ بندہ اگر ان دعاؤں کے حال سے متصف ہو جائے، تو وہ انسانیت کی کس معراج پر پہونچے گا۔

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ قَيِّمُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ مَلِكُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ الْحَقُّ وَوَعْدُكَ حَقٌّ وَلِقَاؤُكَ حَقٌّ وَقَوْلُكَ حَقٌّ وَالْجَنَّةُ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ وَمُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ حَقٌّ اَللّٰهُمَّ لَكَ اَسْلَمْتُ وَبِكَ اٰمَنْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْكَ اَنَبْتُ وَبِكَ خَاصَمْتُ وَاِلَيْكَ حَاكَمْتُ اَنْتَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ فَاغْفِرْ لِيْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَسْرَفْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

ترجمہ:۔ اے اللہ سب تعریفیں آپ ہی کی ہیں۔ آسمانوں اور زمین۔ اور جو

جو مخلوق ان میں آباد ہے، ان سب کی ہستی برقرار رکھنے والے آپ ہی ہیں۔

اور سب تعریفیں آپ ہی کی ہیں، آسمانوں اور زمین اور جو مخلوق ان میں بستی ہے، ان سب کے بادشاہ آپ ہی ہیں۔

اور سب تعریفیں آپ ہی کی ہیں، آسمانوں اور زمین اور جو ان میں ہے ان سب کے نور آپ ہی ہیں۔

اور سب تعریفیں آپ ہی کی ہیں، دراصل موجود آپ ہی ہیں۔

آپ کا وعدہ ٹل نہیں سکتا۔

آپ کی ملاقات ضرور ہونی ہے۔

آپ کا فرمان برحق ہے۔

جنت واقعی موجود ہے۔

اور دوزخ بھی موجود ہے۔

اور نبی سب برحق ہیں۔

اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے برحق پیغمبر ہیں۔

اور قیامت ضرور آنی ہے۔

اے اللہ میں نے آپ کے سامنے اپنی گردن جھکا دی —— اور ——

میں نے آپ کو دل سے مانا —— اور ——

میں نے صرف آپ کی ذات پر بھروسہ کیا —— اور ——

میں صرف آپ کی ہی طرف متوجہ ہوا —— اور ——

جس سے جھگڑا کیا آپ ہی کی مدد سے کیا (یعنی خیر میں) —— اور ——

فیصلے کے لئے آپ ہی کی طرف آیا —— اور ——

آپ ہی ہمارے پروردگار ہیں —— اور ——

لوٹ کر آپ ہی کے سامنے آنا ہے۔
پس میرے سب گناہ بخش دیجئے۔
جو میں نے پہلے کئے تھے اور جو بعد میں کئے۔
جو چھپ کر کئے اور جو کھلم کھلا کئے۔
اور جن کو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔
آپ ہی آگے کرنے والے، اور پیچھے کرنے والے ہیں۔
آپ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔
اور آپ کے بغیر کوئی طاقت و قوت نہیں۔

اس دعا میں عبدیت اور نیازمندی کا انداز کس قدر پُرسوز ہے، اور تفویض و توکل کا رنگ کتنا واضح ہے۔ بندہ، کائنات کی ہر طاقت، اور دنیا کی ہر شوکت سے یکسو ہو کر خود کو خداوند عالم کی بارگاہ قدس میں ڈالے ہوئے ہے۔ اس جگہ صرف وہ ہے، اور اس کا مالک و خالق اور پروردگار ہے۔ سارا عالم اس کی پشت کی طرف ہے، اور اس کا چہرہ خدا کی طرف ہے۔ پھر اسے احساس ہوتا ہے کہ میں پروردگار کے حضور قصوروار ہوں۔ تو وہ ہاتھ پھیلا کر اپنی غلطیونکی تفصیلاً معافی مانگنے لگتا ہے، پھر انکی معبود ہونیکا اقرار کر کے اپنے اور ساری کائنات کے عجز و بے چارگی اعتراف کرتا ہے۔ اور یہ کہ سب طاقت و قوت بس اللہ ہی کو حاصل ہے۔

یہ ایسی دعا ہے کہ جب نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قلب و زبان سے اس کو ادا کیا ہوگا۔ تو رحمت کردگار جھوم کر آئی ہوگی۔ ملکوت اس دعا کی نورانیت دیکھ کر حیران ہوئے ہوں گے۔ پھر خوشی سے اسے لینے کیلئے لپک پڑے ہوں گے۔ آج بھی جو خوش نصیب بندہ اسے رات کے آخری حصہ میں جب کہ

حق تعالیٰ کا خاص نزول آسمان دنیا کی طرف ہوتا ہے، پڑھے گا، توفیق ہے کہ خدا کو اس پر ضرور پیار آئے گا۔

ذوق مہمان نوازی

حدیث شریف میں ہے کہ من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ۔ جو شخص اللہ پر اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہئیے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔

جس بات کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان کے حوالے سے موکد فرمائیں، اس کی شرعی تاکید کیلئے کچھ اور کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، ویسے بھی مہمان نوازی کرم نفس اور شرافت کا طبع کا نہایت اعلیٰ مظہر ہے، یہ ان انسانی فضائل میں ہے۔ جن سے انسانیت کو معراج حاصل ہوتی ہے۔ مہمان نوازی تمام انبیاء کی صفت غالبہ ہے، لیکن اس وصف میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسم گرامی نہایت نمایاں ہے۔ مولانا کو اللہ تعالیٰ نے مہمان نوازی کے باب میں نسبت ابراہیمی سے نوازا تھا۔ مولانا کا بہت وقت تنگدستی میں گزرا ہے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ مرفہ الحالی بھی عطا فرمائی، مگر ان کی مہمان نوازی ہر حال میں یکساں جلوہ گر رہی۔ کوئی بھی آپ کے پاس آجاتا اس کا اکرام فرماتے، اسے نہایت ذوق وشوق سے کھلاتے، اور کھلا کر ممنون کرم ہوتے، گھر میں جو کچھ ہوتا بے تکلف مہمان کے سامنے پیش کر دیتے خود تو بہت کم تناول فرماتے، مگر مہمان کو کھاتے دیکھ کر نہایت خوش ہوتے، مولانا کے اس ذوق اور خلوص کا اثر تھا کہ ان کے یہاں کی سادہ غذائیں، لوگوں کو مرغن اور عمدہ غذاؤں سے زیادہ مرغوب تھیں۔

مہمان نوازی کے انداز اور چند واقعات

حضرت مولانا قاری ولی اللہ صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ حضرت والد صاحب کی مہمان نوازی اطراف میں ضرب المثل تھی، انھوں نے اس سلسلہ کے چند واقعات بیان فرمائے، جس سے انکی اس صفت عالیہ کا انداز بھی معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی کہ اس سلسلہ میں انھیں کس قدر انہماک تھا۔

۱ —— فرماتے ہیں کہ کوپاگنج کے حافظ محمد یعقوب صاحب جو اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ یہی بزرگ ابتداء میں، حافظ عبدالمنان صاحب[1] نابینا کو پاگنج سے فتحپور لایا کرتے تھے۔ یہی حافظ محمد یعقوب صاحب بیان کر رہے تھے کہ میں حافظ صاحب کو فتحپور لے کر ایک دن آیا۔ گرمی کی شدت تھی، دوپہر کا وقت تھا۔ پیاس کی وجہ سے حلق میں کانٹے پڑے ہوئے تھے۔ بھوک بھی خوب لگی تھی، پریشان تھا۔ اسی حالت میں مولانا گھر سے نکلے، میں نے سلام کیا، جواب کے بعد فوراً فرمایا کہ تم نے کھانا نہیں کھایا ہوگا، ٹھہرو میں ابھی لاتا ہوں، چنانچہ فوراً گھر میں تشریف لے گئے، سب لوگ کھانا کھا چکے تھے۔ سالن ختم ہوگیا تھا، تو روٹی اور بھیلی (خشک گڑ) لے کر آئے، اور فرمایا کہ لو یہی کھا لو، سالن ختم ہوگیا ہے اس لئے بھیلی لے کر آیا ہوں۔ روٹی بھیلی کھا کر پانی پی لو۔ بھوک اور پیاس کی شدت میں بھیلی روٹی ملی اور اسے کھایا تو وہ لطف ملا، اور وہ لذت حاصل ہوئی کہ

---

[1] حافظ عبدالمنان صاحب کوپاگنج کے ایک نابینا بزرگ تھے، مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ کے حضور میں انھیں اختصاص حاصل تھا۔ انھیں حضرت سے عشق تھا۔ کوپاگنج میں پڑھاتے تھے۔ روزانہ شام کو حضرت کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تھے، حضرت کی خدمت کرتے، صبح مدرسہ روانہ ہو جاتے، بہت عجیب وغریب بزرگ تھے، حضرت کے وصال کے بعد نہایت بے قرار رہتے تھے اور پھر جلد ہی وہیں پہونچ گئے، جہاں حضرت پہلے پہونچ چکے تھے۔ رحمہ اللہ

آج تک یاد ہے، اور جب کبھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو، پھر سے وہی مزہ محسوس ہونے لگتا ہے۔

۲ —— مانی کلاں کے مشہور ہومیوپیتھ ڈاکٹر جناب محمد غفران صاحب مرحوم، حضرت والا کے مرید بھی تھے، اور خصوصی معالج بھی تھے، ان کی حاضری حضرت اقدسؒ کی خدمت میں کثرت سے ہوا کرتی تھی، وہ فرماتے تھے کہ ایک روز صبح کو حضرت نے مجھے طلب فرمایا، میں تیزی سے جا رہا تھا کہ اتنے میں حضرت مولانا عبد القیوم صاحب مل گئے، عادت کے مطابق انھوں نے فوراً فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب چائے پی لیجئے، میں نے عرض کیا کہ میں اس وقت حضرت والا کے یہاں جا رہا ہوں ابھی چائے نہیں پی سکتا۔ ان کا بیان ہے کہ میں حضرت کے یہاں گیا، وہاں سے فارغ ہوا تو میں نے عرض کیا کہ حضرت! مولوی عبد القیوم صاحب نیچے ملے تھے وہ مجھے چائے پلانے کو کہہ رہے تھے، میں عذر کر کے یہاں چلا آیا۔ تو کیا میں چائے پی لوں، حضرت نے برجستہ فرمایا کہ ضرور پیو، میرے بھائی کا میرے اوپر بڑا احسان ہے کہ وہ میرے مہمانوں کی خاطر داری کرتے ہیں، میں ان کا ممنون ہوں۔ نیچے آکر میں نے مولوی صاحب سے اس کا ذکر کیا، مولوی صاحب بہت خوش ہوئے اور انھوں نے چائے پلائی۔

۳ —— قاری صاحب فرماتے ہیں کہ میرے برادر نسبتی جناب کبیر احمد خاں صاحب والد صاحب کے یہاں آیا جایا کرتے تھے، وہ والد صاحب کی مہمان نوازی سے بہت متأثر تھے، وہ اپنے یہاں دیوگاؤں (اعظم گڈھ کا ایک قصبہ) میں لوگوں سے اس کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ اس تذکرہ کو سن کر دیوگاؤں کے ایک بزرگ حاجی ابوبکر صاحب مرحوم کو والد صاحب سے ملنے کا بہت اشتیاق ہوا۔ تو وہ بھی ایک مرتبہ کبیر بھائی کے ساتھ والد صاحب سے ملنے کیلئے فتحپور

آئے۔ وہ فرمارہے تھے کہ میں نے کبیر بھائی سے جتنا سنا تھا۔ اس سے زیادہ پایا فرمایا کہ جب ہم لوگ رخصت ہونے لگے، تو دو روپیہ ہدیہ بھی دیا۔ اور فرمایا کہ راستہ میں کچھ کھالینا۔ میں اس سے بہت متأثر ہوا۔

قاری صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ میں جب کبھی دلوگاؤں جاتا تھا، وہ والدصاحب کی ضیافت کا تذکرہ بڑے لطف سے کیا کرتے تھے۔

ایک عجیب انداز

حضرت قاری ولی اللہ صاحب مدظلہ کے برادر نسبتی جناب کبیر خان صاحب فرمارہے تھے کہ حضرت مولانا مرحوم کا انداز میزبانی عجیب تھا۔ جاڑوں میں مہمان پہونچتے تو، بسا اوقات مولانا گرم چادر اوڑھے ہوئے تو مہمانوں کو اوڑھادیتے، اپنے کپڑے اتار کر دینے لگتے،

قاری صاحب مدظلہ نے ایک واقعہ بیان کیا کہ گاؤں کے ایک غریب آدمی والدصاحب کے پاس آئے، اور کہنے لگے کہ مولوی صاحب میرے پاس بنیائن نہیں ہے، ایک بنیائن دیدیں۔ والدصاحب نے فوراً اپنی پہنی ہوئی بنیائن اتار کر انھیں دیدی، وہ بہت خوش ہوئے، میں گھر کے اندر موجود تھا۔ والدصاحب گھر میں آئے، اور مجھے بلاکر ارشاد فرمایا کہ اپنے پاس سے مجھے ایک بنیائن دے دو۔ میں نے بنیائن دی اور پوچھا کہ آپ تو بنیائن پہنے ہوئے تھے، وہ کیا ہوئی۔ اس پر انھوں نے واقعہ بتایا، میں نے عرض کیا کہ آپ کو بنیائن اتار کر دینے کی کیا ضرورت تھی، مجھے بلاکر آپ حکم فرماتے میں دیدیتا، فرمایا کہ بات تو ٹھیک ہے، لیکن شاید تاخیر کی وجہ سے وہ شک و شبہ میں پڑجاتا کہ ملے گی یا نہیں؟ اس لئے میں نے فوراً ہی اتار کر دیدی۔

ان واقعات سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہمان نوازی انکا طبعی اور فطری ذوق تھا، وہیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں وہ تکلف کو دخل نہیں دیتے تھے، بلکہ جو کچھ موجود ہوتا، بے تکلف پیش کردیا کرتے تھے، اس سے مہمان کو کسی قدر راحت ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں۔ جنھیں بکثرت مہمان بننے کا اتفاق ہوتا ہے، اور وہ پر تکلف میزبانوں کے تکلفانہ رویے سے مشکلات میں گرفتار ہوتے رہیں۔

اہل تعلق کے حقوق کی ادائیگی :

مولانا باوجودیکہ ذکر وفکر میں بہت منہمک رہتے، تاہم اہل تعلق کے حقوق کا بہت پاس ولحاظ رکھتے، مولانا کو اپنے متعلقین اور رشتہ داروں کی اور ضرورتوں کی خبر رہتی، اپنی وسعت کے مطابق ضرورتمند رشتہ داروں کی مدد فرماتے رہتے لپنے تو خیر اپنے ہیں۔ دوسرے لوگ بھی آپ کی خدمت میں آتے، تو ان کو رخصت کرنے کچھ دور جاتے اور گنجائش کے مطابق ہدیہ پیش کرتے۔

عام حالات :

مولانا نے ابتدائی زندگی تنگدستی میں گزاری ہے، لیکن اللہ تعالےٰ نے صبر وقناعت کا جوہر طبیعت میں ودیعت کر رکھا تھا۔ اس نے سب سے بے نیاز بنائے رکھا، کچھ کھیتی وغیرہ کرا لیتے تھے، طبیعت میں سخاوت کا مادہ تھا۔ اس لئے مقروض بھی ہوجایا کرتے۔ مگر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر صابر وشاکر رہے، کوئی ضرورت سامنے آتی تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے میں لگ جاتے، بعد میں جب صاحبزادگان بمبئی رہنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے

وسعت عطا فرمائی۔ اس وقت امراض وتکالیف جسمانی نے آگھیرا۔ اخیر عمر گوناگوں تکالیف میں بسر ہوئی۔ جب صحت تھی تو غربت وتنگی کا ڈیرہ گھر میں تھا۔ جب عسرت رخصت ہوئی اور وقت آیا کہ فارغ البالی سے بہرہ اندوز ہوں، تو امراض وتکالیف کا ہجوم ہوگیا۔ گویا یہ دنیا سجن للمومن (مومن کے لئے قیدخانہ) بن کر رہی۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندے پر رحمت خاص ہے کہ ایمان واعمالِ صالحہ کی توفیق دیتے رہیں۔ اور دنیا کے حظوظ ولذائذ سے اسے برکنار ہی رکھیں تاکہ آخرت میں کامل ترصلہ نصیب رہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جب کوئی عمدہ شئے لائی جاتی، تو آپ رونے لگتے، اور فرماتے کہ میں اس کے استعمال سے ڈرتا ہوں کہ کل بروز قیامت اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرما کر مجھے ہٹا نہ دیں کہ اذھبتم طیباتکم فی حیاتکم الدنیا واستمتعتم بہا۔ (احقاف) تم نے اپنی تمام لذت کی چیزیں دنیا ہی میں حاصل کرلیں، اور ان سے فائدہ اٹھالیا۔ اب یہاں بجز عذاب اور کیا ہے۔

واقعی جب اللہ تعالیٰ آخرت میں کسی بندے کو نوازتے ہیں، تو دنیا میں مصائب کے ہجوم میں اسے گھیر دیتے اور اسے صبر ورضا کی توفیق دیتے ہیں۔ اس طرح اس کے دل میں دنیا کی ذرا بھی محبت نہیں ہوتی۔ مولانا کی زندگی اسی رحمتِ خداوندی کا نمونہ اور مظہر تھی۔

حج بیت اللہ

اللہ والوں کا اصل سرمایہ، اللہ تعالیٰ کی محبت، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی پیروی اور ان سے گہری وابستگی اور والہانہ شیفتگی ہوتی ہے اس سرمایہ کے بغیر بزرگی اور ولایت کا تصور ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر جن لوگوں کو

یہ متاع گرانمایہ حاصل ہوتی ہے، انھیں ان تمام چیزوں اور ان تمام لوگوں سے بھی محبت ہوجاتی ہے۔ جن کا اللہ تعالیٰ سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خصوصی تعلق ہوتا ہے۔ مکۃ المکرمہ، کعبۃ المقدسہ، مدینۃ المنورہ اور ان کے متعلقات واطراف وہ مقامات ہیں جن کا گہرا تعلق اللہ ورسول کے ساتھ اتنا واضح اور نمایاں ہے، جس کو مسلمان تو خیر مسلمان ہیں غیر مسلم بھی اس سے بخوبی واقف ہیں، جس شخص کو اللہ سے محبت ہے۔ اس کو بیت اللہ سے بھی تعلق ہے۔ بیت اللہ، اللہ تعالیٰ کی تجلیات خاصہ کا مرکز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مسلمان عموماً اور اہل اللہ خصوصاً ہمیشہ وہاں حاضری کے آرزومند رہا کرتے ہیں۔ وہی قبلۂ سجدہ گزاراں ہے۔ وہی جان دین وایمان ہے، وہ نسبت الہیہ کی تکمیل کا سامان ہے، وہ مجمع اولیاء جہاں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے تمام دنیا کا ملجا وماوی بنایا ہے۔ جس شہر میں وہ ہے، اسے ام القری قرار دیا ہے۔ یہ مسلمان، خواہ وہ کہیں ہو، حق تعالیٰ کی خصوصی عبادت نماز کے ادا کرنے میں ادھر ہی اپنا رُخ کرتا ہے۔ اگر اس کا دل وہاں کی حاضری وزیارت کے لئے بیتاب وبیقرار ہو تو کیا وہ کچھ محل تعجب ہے؟

مولانا کو حج کی آرزو رہا کرتی تھی، مگر تکمیل آرزو کے ظاہری اسباب مفقود تھے۔ یکایک غیب سے رحمت کی ہوا چلی اور وہی بات جس کا عالم اسباب کے لحاظ سے کوئی تصور نہ تھا۔ یکایک عالم غیب سے عالم شہود میں نمودار ہوگئی اسباب منہ دیکھتے رہ گئے۔ تدبیریں ہکا بکا ہوگئیں، اور اللہ کا بندہ نصرت غیبی کی پوشیدہ تدبیر کے ہاتھوں بیت اللہ کے مواجہ میں جا کھڑا ہوا۔

ہوا یوں کہ ایک روز مصلح الامت عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ قدس سرہٗ نے عصر کی نماز پڑھی، مولانا کو اس وقت مستقل معیت کا

شرف حاصل ہو چکا تھا۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی حضرت پر کیا کیفیت طاری ہوئی صف سے سر نکال کر مولانا کو بآواز بلند خطاب فرمایا۔ مولوی صاحب اب تک تو جہت کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ اب چلئے عین کعبہ کی جانب رخ کر کے نماز پڑھیں گے۔ یہ بات تین مرتبہ نہایت جوش اور قوت کے ساتھ فرمائی۔ اور فرمایا چلئے حج کو چلیں گے۔ مولانا نے اس صدائے حق پر بے تکلف لبیک کہی۔ مال و متاع نہ ان کے پاس کچھ تھا نہ ان کے پاس! لیکن ایک اللہ والے کے دل اور زبان سے نکلی ہوئی بات تھی۔ اس پر نہ اعتراض کی گنجائش تھی، نہ اشکال کی ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود!!
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

مولانا نے عرض کیا بہت اچھا حضرت! ضرور چلیں گے۔

اتنی گفتگو ہوئی۔ حضرت اپنے گھر تشریف لے گئے اور مولانا اپنے گھر۔ دونوں کے گھروں میں فاصلہ تھا ہی کیا؟ مولانا نے گھر میں داخل ہوتے ہی اہلیہ محترمہ سے فرمایا کہ ہم لوگ اس سال حج کو جائیں گے۔ انھوں نے عرض کیا کہ انتظام کیا ہے؟ فرمایا کہ حضرت کا حکم ہے۔ اہلیہ محترمہ نے کہا کہ میں بھی ساتھ چلوں گی۔ مولانا نے فرمایا کہ تم کو تمہارے بیٹے حج کرائیں گے۔ ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی باہر سے حضرت کی آواز سنائی دی۔ مولانا باہر نکل آئے حضرت فرما رہے تھے کہ آپ گھبرائیں نہیں، آپ کے حج کا انتظام میں کرونگا مولانا نے ادب سے عرض کیا کہ نہیں حضرت! آپ تکلیف نہ فرمائیں۔ میں اپنا انتظام خود کر لوں گا۔ حضرت ان کے جواب سے خوش ہوئے۔

مولانا فرماتے تھے کہ میں جانتا تھا کہ حضرت خود معذور ہیں کہ اپنے لئے

سفر خرچ مشکل ہے وہ تو میرے خرچ کا انتظام میری دلداری کے واسطے اپنے اوپر لے رہے تھے۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ حضرت کو اس فکر اور اس بار سے سبکدوش رکھوں۔

اس وقت حج کا کل صرفہ چار پانچ سو روپئے کا تھا۔ مگر اس کا انتظام بھی مشکل تھا، مولانا کے ایک عزیز جو حکومت کے کسی عہدے سے ریٹائر تھے انھوں نے ان دونوں بزرگوں کے سفر حج کا قصہ سنا تو مولانا کے پاس آئے اور عرض کیا آپ دونوں حضرات سفر حج میں جانے والے ہیں۔ مولانا نے اثبات میں جواب دیا۔ انھوں نے کہا کہ میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلوں گا۔ لیکن میرا انتظام آپ کے ذمہ ہے۔ میرا فلاں کھیت آپ لے لیجئے گا۔ مگر خرچ کا انتظام آپ ہی کو کرنا ہے۔

چنانچہ مولانا نے ان کا بھی انتظام کیا، اور حضرت کی معیت میں یہ دونوں اور دو آدمی مزید کل پانچ آدمیوں کا قافلہ حج کو گیا۔ اور بخیر و عافیت حج کر کے واپس آیا۔ ایک اللہ والے کی معیت و صحبت نے اس حج میں عشق و محبت اور والہیت و شیفتگی کا جو رنگ بھرا ہوگا۔ اس کو کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کو کبھی اس کا ذائقہ نصیب ہوا ہوگا۔

دوسرا حج:

پہلا حج تو حضرت کی معیت میں ہوا، دوسرا حج انھوں نے اپنے فرزند عزیز حضرت مولانا قاری ولی اللہ صاحب کے ساتھ کیا۔ یہ حج سنہ ۱۹۷۲ء میں کیا ہے حضرت قاری صاحب اس وقت بمبئی میں تھے پانی کا پہلا جہاز شعبان کے وسط میں جایا کرتا تھا، قاری صاحب اپنے فرائض اور کاموں کے باعث

شعبان کے جہاز سے نہیں جا سکتے تھے۔ مگر مولانا پر اشتیاق غالب تھا۔ بڑھاپے کی وجہ سے تنہا سفر کرنا سخت باعث مشقت تھا۔ مگر شوقِ حرمین، مشقت و تکلیف کی ہر تصوّر پر غالب تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ تم شوال میں آنا۔ مجھے پہلے جہاز سے جانے دو۔ میں رمضان وہیں گزاروں گا۔ قاری صاحب نے مجبور ہو کر اس بات کو منظور کر لیا۔ حالانکہ والد مکرم کی پریشانی کے تصور سے سخت ہراساں تھے، مگر کوئی چارہ نہ تھا۔

مولانا شعبان کے اخیر عشرہ میں مکہ مکرمہ پہونچ گئے ۱۵ر رمضان تک مکہ مکرمہ میں رہے۔ ۱۵ر کے بعد مدینہ طیبہ میں حاضری دی۔ اس وقت خوب سردی کا زمانہ تھا۔ مدینہ میں سخت ٹھنڈک پڑتی ہے۔ اس ٹھنڈک کا پہلے سے اندازہ نہ تھا۔ مولانا اوڑھنے پہننے کا سامان کم لائے تھے جسمانی مشقت بہت ہوئی رمضان المبارک میں بھی اور اس کے بعد شوال میں بھی مولانا کا ہمیشہ کا دستور یہی تھا کہ تہجد کے وقت مسجد آجاتے تھے، اور پورے خشوع و خضوع کے ساتھ تہجد و تلاوت اور درود و ذکر میں مشغول رہتے روضہ اقدس پر مواجہ شریف میں حاضر ہوتے تو گھنٹوں کھڑے رہتے، اور اس دوران آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری رہتے۔ ایک صاحب نے قاری صاحب کو بتایا کہ میں ہر روز دیکھا کرتا کہ پڑھنے والے درود و سلام پڑھ کر چلے جاتے اور مولانا محویت و استغراق کے عالم میں مسلسل کھڑے رہتے۔ نہ جسم میں حرکت ہوتی، نہ پاؤں بدلتے، اور اسی طرح مسلسل آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بندھی رہتی۔

قاری صاحب مدظلہ ذی قعدہ کے وسط میں سیدھے مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ وہاں کی سردی کی اطلاع پا کر گرم کپڑے اور لحاف لے کر گئے

تھے۔ یہ پہلا دن تھا کہ مولانا کے جسم پر رات میں لحاف پڑا۔ صبح وقت پر بیدار ہوئے، تو فرمایا کہ الحمد للہ آج سویا ہوں۔ صرف اتنا فرمایا۔ لیکن اس سے اندازہ ہوا کہ اس سے پہلے کبھی رات کو پوری نیند نہیں ملی تھی۔ مگر جوار رسول کی حاضری نے سب غم غلط، اور سب دشواری سہل کر رکھی تھی۔

حج کا زمانہ آیا تو مکہ مکرمہ میں حاضری ہوئی جوانوں جیسی عزیمت و ہمت سے حج کے ارکان ادا کئے، طواف تو اتنی کثرت سے کرتے کہ جوانوں اور جواں ہمتوں کو رشک آتا۔

حج سے فراغت کے بعد مولانا کی واپسی کا جہاز جلد تھا۔ اور قاری صاحب چونکہ بعد میں آئے تھے، اس لئے ان کا جہاز بعد میں تھا۔ مولانا کی خواہش تھی کہ قاری صاحب ساتھ ہی واپس ہوں۔ اور قاری صاحب کو کم موقع ملا تھا۔ اس لئے انھیں شوق تھا کہ ابھی کچھ اور دن خوش بختی و خوش نصیبی کے یہ ایام میسر ہوں۔

مولانا جب حج کے لئے عازم سفر تھے، تو شوق غالب تھا۔ اس مشقت و دشواری کی طرف التفات نہ تھا۔ مگر اب واپسی میں دوری و مجبوری کا درد، ہجوم کئے ہوئے تھا۔ اب ہر مشقت بھاری، اور ہر دشواری زائد معلوم ہوتی تھی۔ اس لئے بیٹے کے شوق فراواں کے باوجود ان پر یہی غلبہ تھا کہ یہ ساتھ چلیں۔ قاری صاحب جو سراپا خدمت میں والد کی خواہش سے کیوں کر پہلو تہی کر سکتے تھے۔ بخوشی و رضامندی ساتھ میں واپسی پر تیار ہو گئے لیکن اس کا طبعی اثر ان کے دل پر موجود تھا گو کہ ظاہر نہ کرتے تھے، مگر حزن و ملال کی بدلیاں دل پر چھائی رہتی تھیں۔ اس کو وہاں رہنے والے ایک بزرگ مولانا عبد الغفار صاحب الہ آبادی نور اللہ مرقدہ نے محسوس کیا۔ یہ مولانا

عبدالغفار صاحب، حضرت مصلح الامت نوراللہ مرقدہٗ کے قریبی متوسلین میں سے تھے۔ ان کے واسطے سے، حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ، حضور سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارکہ میں سلام پیش کرتے۔ اور درخواست دعا کرتے، انھوں نے ایک بار قاری صاحب کو دلگیر پایا تو بڑے جوش کے ساتھ فرمایا کہ آپ والد صاحب کے ساتھ جائیں اور بالکل نہ گھبرائیں آپکو تو دو حج کا ثواب ملا۔ ایک حج کا ثواب اور ایک والد صاحب کی خدمت کا ثواب اور پھر فرمایا کہ آپ بہت جلد پھر آئیں گے۔ چنانچہ اللہ نے یہ بات سن لی۔ قاری صاحب کو ہر سال شرف حضوری حاصل ہوتا ہے، اور تنہا نہیں نہ جانے کتنے لوگ اس سایۂ برکت میں شرفیاب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سایۂ برکت کو بصحت وعافیت سلامت باکرامت رکھے۔ آمین۔

وفات حسرت آیات

اوپر ذکر آچکا ہے کہ عمر کے آخری حصے میں مولانا مسلسل علیل رہے گوناگوں امراض میں مبتلا رہے۔ بالآخر یہی امراض قید ہستی سے رہائی کا ذریعہ بنے، اور جس دن کے لئے طاعت وعبادات کی اور ذکر وفکر کی جدوجہد کی تھی، وہ وقت آن پہونچا۔ جس دن کی آرزو تمام اہل اللہ کو ہوتی ہے، اور جس کے انتظار میں ساری عمر بسر ہوتی ہے، وہ دن آگیا، کشتیٔ حیات، ساحل مراد پر آلگی یعنی ۷/ محرم الحرام ۱۳۹۹ھ مطابق ۸/ دسمبر ۱۹۷۸ء بوقت سوا بارہ بجے دن، جب جمعہ کے فرشتے اپنا اپنا دفتر سنبھال کر جمعہ کی حاضری کی فہرست تیار کرنے کے لئے آرہے تھے جمعہ کی ساعت مبارکہ تھی، کہ حضرت مولانا کی طاعت وعبادت اور ذکر وتلاوت کے نور میں لپٹی ہوئی روح عالم بالا کو جارہی تھی۔ کتنا مبارک وقت

اور کیسی مقدس ساعت پائی۔

اللہ تعالیٰ کی نوازش کے انداز عجیب ہیں۔ وہی مجاہدہ کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ پھر وہی اس کی توفیق بخشتے ہیں۔ پھر وہی اس کو قبول کرتے ہیں اور پھر وہی اس کا صلہ بھی دیتے ہیں۔ جو کچھ ہے، سب انھیں کا ہے، اور جو لوگ ہیں سب انھیں کے پاس سے آئے ہیں اور سب انھیں کے پاس پلٹ پلٹ کر جاتے ہیں، اور جاتے رہیں گے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے، ان سے راضی ہو، انھیں راضی کر دے۔

نکاح اور اولاد

حضرت مولانا مرحوم کا نکاح بھی ایثار و خود شکنی کا ایک نمونہ تھا۔ مولانا کے بڑے بھائی جلیل خاں صاحب کا نکاح ہوا تھا، ان سے ایک صاحبزادے اسد اللہ نامی پیدا ہوئے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی بیوہ اور یتیم بچے کی دیکھ ریکھ اور پرورش اور نگہداشت کا مسئلہ اہم تھا۔ گھر کے سرپرستوں کی رائے ہوئی کہ بیوہ کا نکاح مولانا سے کر دیا جائے۔ اس طرح بیوہ کے آنسو پونچھ جائیں گے۔ اور یتیم بھتیجے کی پرورش بھی ہو جائے گی۔ چنانچہ عدت گزرنے کے بعد ان سے مولانا کا نکاح کر دیا گیا۔ مولانا نے اپنے بھتیجے کی تعلیم تربیت اور پرورش اپنے بیٹے ہی کی طرح کی۔

قاری اسد اللہ صاحب بہت خوش گلو اور خوش ادا قاری تھے، آواز بہت بلند تھی۔ دارالعلوم مئو میں جب وہ متعلم تھے اور قرآن کی تلاوت کرتے

تو مسلمانوں اور ہندؤں کا ٹھٹھ لگ جاتا۔

فراغت کے بعد قاری صاحب بہاولپور پاکستان چلے گئے تھے، جامعہ عباسیہ بہاولپور میں استاذ تھے، ہندوستان بھی کبھی کبھی تشریف لاتے تھے بہت ہی مجلسی آدمی تھے، گفتگو کا ملکہ تھا۔ علامہ اقبال کے اشعار خوب یاد تھے، اور خوب سنایا کرتے تھے۔ ۱۹۷۷ء میں ان کا وصال ہوا۔ رحمہ اللہ

حضرت مولانا کو اللہ تعالیٰ نے چار فرزند اور ۲ بیٹیاں عطا فرمائیں۔

۱ — جناب قاری ابصار اللہ صاحب مدظلہ، بمبئی کماٹی پورہ تیسری گلی رحمت مسجد کے امام ہیں۔

۲ — جناب قاری عبدالسلام صاحب مدظلہ بمبئی ہی میں مرغا گرین فاکلینڈر روڈ میں امام ہیں۔

۳ — جناب حافظ عبدالمنان صاحب مدظلہ۔ فتحپور میں مقیم ہیں۔

۴ — حضرت مولانا قاری حافظ ولی اللہ صاحب مدظلہ۔ امام وخطیب نور مسجد ڈونگری بمبئی۔

قاری ابصار اللہ صاحب، قاری عبدالسلام صاحب اور قاری ولی اللہ صاحب بمبئی میں مختلف مساجد میں امامت وخطابت کے فرائض انجام دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان حضرات سے بالخصوص قاری ولی اللہ صاحب مدظلہ تصحیح عقائد اور ترویج شریعت کا بڑا کام لیا، حق تعالیٰ قبول فرمائیں، حافظ عبدالمنان صاحب فتحپور میں مقیم ہیں، اور مدرسہ انوار العلوم فتحپور کے منتظم ہیں۔ اور اس راہ سے دین اور علم دین کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

مجموعۂ محاسن ومکارم

حضرت مولانا حافظ قاری ولی اللہ صاحب مدظلہ

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا ⁂ کہ نطق نے مرے بوسے مری زباں کے لئے
اے کہ مجموعۂ خوبی! بچہ نامت خوانم

ایک ایسی شخصیت، جو محب بھی ہے اور محبوب بھی خادم بھی ہے اور مخدوم بھی! دلفگار بھی ہے اور دلآویز بھی وہ حاجی بھی ہے۔ اور معلم الحجاج بھی! حاجی ایک سال کا نہیں، ہر سال کا! صرف معلم الحجاج ہی نہیں، رہبر حجاج بھی! مخدوم ایسا کہ اس کی خدمت کر کے دل نہال ہو جائے، اور خدمت گزار ایسا کہ اس کی رفاقت کے تصور سے طبیعت شگفتہ ہو جائے۔ اس کی صحبت میں بیٹھئے تو اس کی باتیں دلنواز! اس سے رخصت ہوئیے تو اس کی دعائیں ہمدم ودمساز، وہ مسجد نور کا امام وخطیب ہے، جس کے منبر ومحراب سے وہ حق وہدایت کی نور پاشی کرتا ہے سفر حج میں اس کے ساتھ ہو جائیے، تو سفر سوارت ہو جائے، حج کی حلاوت مل جائے، وہ قلب وباطن کا ولی اللہ! وہ قول وعمل کا ولی اللہ! اور نام بھی اس کا ولی اللہ! سبحان اللہ نور علی نور۔

ان سے میرا تعارف سفر حج میں ہوا۔ غائبانہ واقفیت پہلے سے تھی، وہ بھی شاید مجھے جانتے تھے، سفر حج میں متعارف ہوا۔ قرب ہوا، ان کی خوبیوں کا اندازہ ہوا، وہ حاجیوں کے بے عذر خدمت گزار ہیں۔

حج کا سفر بڑی مشقت اور دشواریوں کا سفر ہے، یہ ایک بھٹی ہے، جو انسان کے اندرون کو کھول کر باہر کر دیتی ہے کتنے لوگ جن میں باہم دلی دوستی محسوس ہوئی سفر حج نے دونوں کے اوراق باطن کو الٹا، تو ہر صفحہ عداوت کے دھبوں سے سیاہ نظر آیا۔ بات بات میں الجھ پڑنا، لڑ جانا، بارہا دیکھا، لیکن قاری صاحب کو بہت قریب سے دیکھا، مسلسل چالیس روز تک دیکھا، تند طبع اور شعلہ مزاج رفقاء کے ساتھ دیکھا، بہت باتونی اور سراپا سکوت لوگوں کے درمیان دیکھا، مگر ان کا تحمل، انکی دلنوازی، ان کی دلآویز مسکراہٹ اور انکی خدمت گزاری میں کوئی فرق نہیں پایا جس کام کیلئے ان سے گزارش کیجئے بالکل تازہ دم اور مستعد! گزارش کرنیوالے سے زیادہ اس کیلئے فکرمند!

قاری صاحب نے ابتدائی تعلیم حفظ قرآن سے شرح وقایہ تک اپنے والد مکرم سے حاصل کی، اس کے بعد دار العلوم مئو میں مشکوٰۃ شریف تک تعلیم پائی اور دورۂ حدیث شریف کیلئے جامعہ مظاہر علوم سہارنپور میں حاضر ہوئے، ذہانت و ذکاوت کا جوہر خداداد تھا۔ اس پر والد مکرم کی ابتدائی تعلیم کی وجہ سے صرف و نحو میں خوب پختگی تھی۔ عبارت خوانی کا ملکہ تھا۔ جہاں گئے اساتذہ کے منظور نظر بن کر رہے۔ دورۂ حدیث کی تمام کتابوں بالخصوص بخاری شریف کی زیادہ تر قرأت پورے سال قاری صاحب ہی نے کی، اور بڑی بات یہ کہ پورے سال میں کسی سبق کا ناغہ نہیں ہوا۔ اور نہ کوئی حدیث قرأت یا سماعت سے فوت ہوئی، بیماری ہو یا صحت، تکلیف ہو یا آرام ہر صورت میں اسباق کی حاضری برقرار رہتی۔

فراغت کے بعد کچھ دنوں اعظم گڑھ شہر میں تدریس کی خدمت انجام دی۔ پھر حالات نے ممبئی پہونچا دیا۔ اب عرصہ سے نور مسجد میں امام و خطیب ہیں، قاری صاحب نے ممبئی کو بہت کچھ دیا، دینداروں کا ایک طبقہ قاری صاحب کی برکت

سے وجود میں آیا علماء ومشائخ حقہ کے پہونچنے کی راہیں ہموار ہوئیں۔ قاری صاحب کا تعلق بیعت واصلاح مصلح الامت حضرت شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمۃ سے تھا، حضرت کے وصال کے بعد ان کے خلیفہ حضرت مولانا شاہ عبدالحلیم صاحب جونپوری مدظلہ کی خدمت میں رجوع کیا۔ اور وہاں سے اجازت وخلافت سے نوازے گئے۔ قاری صاحب کو اپنے والدگرامی سے بھی اجازت ہے۔